شذرات

قرآنیات

معارف نبوی

سیر و سوانح

نقطۂ نظر

نقد و نظر

سانحۂ عباس ٹاؤن: علمی تحقیقات کی ضرورت

۳ مارچ ۲۰۱۳ کو کراچی کے علاقے عباس ٹاؤن میں خوف ناک بم دھماکوں کے باعث بچوں اور خواتین سمیت ۵۰ جاں بحق اور ۱۴۶ زخمی ہو گئے۔ مجلس وحدت المسلمین نے ۱۰ روزہ اور تحفظ عزاداری کونسل نے ۳ روزہ سوگ کا اعلان کیا۔ تعلیمی ادارے بند کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ آئی جی سندھ نے تحقیقات کے لیے کمیٹی قائم کر دی اور رینجرز نے شہر میں دہشت گردوں کے خلاف بھر پور کریک ڈاؤن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مذہبی رہنماؤں میں اسلم سلیمی، طاہر القادری، فضل الرحمٰن، ساجد میر، حافظ سعید نے دھماکوں کی شدید مذمت کی۔

افسوس! اس انتہائی گھمبیر مسئلے کو سادہ طور پر لیا جا رہا ہے۔ ایک دن تعلیمی ادارے بند کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا بلکہ کھلے ہوئے تعلیمی اداروں کے بارے میں آنکھیں کھولنا ہوں گی۔ مذہبی اور عام تعلیمی اداروں کے نصاب کا جائزہ لینا ہو گا۔ علمی اختلاف انسانی مخالفت کیسے بن گیا ہے؟ انسانی اخلاقیات کا درس کیوں نہیں دیا جا رہا؟ ہمارے اندر تعصّبات نے اپنی جڑیں اس قدر گہری کیسے کر لی ہیں؟ اگر اہل تشیع پر ظلم ہوا، تو اس پر صرف شیعہ تنظیمیں ہی کیوں متحرک ہوئیں؟ فرامین نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ ہیں کہ: ''اہل ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا سر کے ساتھ جسم کا۔ وہ اہل ایمان کی ہر تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سر جسم کے ہر حصے کا درد محسوس کرتا ہے۔'' (مسند احمد) ''جو شخص کسی پر رحم نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر بھی رحم نہ کیا جائے گا۔'' (بخاری، کتاب الآداب)

عباس ٹاؤن کے ظلم پر سب کا درد ایک جیسا کیوں نہ ہوا؟

آئی جی سندھ نے تحقیقات کے لیے خفیہ ایجنسیوں کے افسران پر مبنی کمیٹی قائم کر دی، لیکن ایک اور علمی اور سماجی تحقیقاتی کمیٹی بھی بننی چاہیے جو یہ جاننے کی کوشش کرے کہ رحمٰن ورحیم کو اپنا خدا ماننے والوں، رحمۃ للعالمین کو اپنا

رسول ماننے والوں، ہر ملنے والے کو سلامتی کی دعا دینے والوں کے اندر یہ وحشت و بربریت کہاں سے آ گئی؟ اسلام جیسے دین سلامتی کو ماننے والوں کے مذہب اور ان کے رویوں میں یہ خوف ناک تضاد کیسے پیدا ہو گیا؟ شہروں کی دیواروں پر باہمی نفرت و عداوت اور کفر کے فتووں پر مبنی عبارتیں کیسے لکھ دی جاتی ہیں اور حاکم اور معاشرہ اسے کیسے برداشت کر لیتا ہے؟ اگر اس خونی کھیل کے پیچھے بیرونی دشمن بھی کارفرما ہیں تو ہمارے لوگ ان کے آلۂ کار کیسے بن جاتے ہیں؟

محترم اسلم سلیمی، ڈاکٹر طاہر القادری، مولانا فضل الرحمٰن، پروفیسر ساجد میر، حافظ سعید کی خالی مذمت کافی نہیں ہے۔ ایسی مذمت تو سیاست دانوں اور حکمرانوں نے بھی کی ہے۔ آپ علماے دین ہیں۔ آپ نبیوں کے وارث ہیں۔ آپ سیاست دانوں اور حکمرانوں سے بلند تر لوگ ہیں۔ آپ سے توقعات بھی بلند تر ہیں۔ اعلیٰ علمی اور سماجی شعور کی امیدیں ہیں۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب کو ماننے والوں میں کچھ ایسے لوگ کیسے پیدا ہو گئے جو بچوں اور عورتوں کو بھی ناحق قتل کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ انسانوں کے مابین اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک فطری امر ہے، لیکن ہمارے اندر ان اختلافات کو برداشت کرنے کا کلچر کیوں نہیں پیدا ہو سکا؟ اختلاف کرنے کے آداب کیوں نہیں اپنائے گئے؟ اہل مغرب کی طرح ہمارے اندر جیو اور جینے دو کا مزاج کیوں نہیں پیدا ہوا؟ آپ کھل کر کفر اور قتل کے فتوے دینے والوں کی مذمت کیوں نہیں کرتے؟ کفر و قتل کی علمی دکانوں کے خلاف علمی کریک ڈاؤن کیوں نہیں کرتے؟

کتاب ہدایت کو محض ایصال ثواب اور حصول ثواب کا ذریعہ بنا کر ہی کیوں رکھ دیا گیا ہے؟ اگر قوم اسے سمجھ کر پڑھنا شروع کر دے تو کیا اللہ کی یہ رسی پارہ پارہ امت کو وحدت کی لڑی میں پرونے کا اہتمام نہیں کر سکتی؟ اسرائیل، امریکہ اور بھارت تو قرآن کو سمجھ کر پڑھنے سے نہیں روکتے۔ اور اس کے بعد اس پر بھی تحقیقات ہونی چاہییں کہ دنیا کی ہر کتاب میں الفاظ اور عبارات کا مفہوم طے کرتے وقت ان کا سیاق و سباق دیکھا جاتا ہے، مگر ہمارے ہاں عقل عام پر مبنی یہ اصول قرآن مجید پر لاگو کیوں نہیں کیا جاتا؟ آیات کو سیاق و سباق سے کاٹ کر ان کی تشریح کیوں کی جاتی ہے اور ان کا اطلاق اپنی خواہش کی بنیاد پر، کبھی اپنے گروہ پر اور کبھی دوسرے گروہ پر کیوں کر دیا جاتا ہے؟

ایک دفعہ کسی عالم دین کی تقریر سننے کا دردناک اتفاق ہوا۔ اس نے قرآن مجید کی سورۂ کافرون کا حوالہ دیا اور کہا کہ ہمارے رسول نے کہا کہ ''اے کافرو''، اور پھر اپنے مخالف مذہبی گروہ پر اس کا اطلاق کرتے ہوئے کہا کہ کافر کہنا تو میرے نبی کی سنت ہے۔ اور یہ بتایا ہی نہیں کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم قریش کے لیڈروں

کو اتمام حجت کے بعد مخاطب کیا تھا۔ (اتمام حجت کے بعد، یعنی دین حق کو اپنی بے مثل اعلیٰ ترین اخلاقی شخصیت، تبلیغ اور دلیل کے ذریعے سے پوری طرح واضح کرنے کے بعد)۔ اللہ کی رحمتیں نازل ہوں مولانا امین احسن اصلاحی پر، انھوں نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں کیسا اعلیٰ تدبر کیا ہے اور کس قدر احسن طریقے سے اس آیت کا اطلاق سمجھایا ہے۔ سورۂ کافرون سے پچھلی سورتوں میں تمام تر بحث قریش کے لیڈروں ہی سے رہی ہے۔ کافرون، سورہ نمبر ۱۰۹ ہے۔ اس سے پیچھے ۱۰۶ نمبر سورہ کا نام ہی قریش ہے۔ جس میں قریش کی قوم کو سمجھایا جا رہا ہے کہ انھیں عرب میں جو وقار حاصل ہے اس میں اصل دخل ان کی ذہانت و قابلیت اور ان کے حسن تدبیر کو نہیں، بلکہ بیت اللہ کے ساتھ ان کے تعلق اور اس کے خادم ہونے کو ہے۔ ان کی معاشی زندگی میں خون کی گردش انھی تجارتی سفروں سے ہے جن کی کامیابی کی ضمانت ان کو بیت اللہ کے متولی ہونے کی بدولت حاصل ہے۔ اس لیے وہ دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں ان حقوق و فرائض کو نہ بھول بیٹھیں جو خانہ کعبہ اور اللہ سے متعلق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ سورۂ کافرون سے قبل خطاب قومی اور انسانی بنیاد پر ہوا، کہیں قریش کو کافر نہیں کہا گیا۔ اتمام حجت کے بعد ہجرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ رسول کو ہجرت کا حکم اسی وقت دیتا ہے جب قوم کے رویے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر ایمان قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ قوم اپنی سرکشی میں آ کر رسول کی جان لینے کی کوشش کرے گی۔ چنانچہ رسول کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ قوم سے برأت کا اعلان کر کے ہجرت کرے اور قوم سے الگ ہو جائے۔ چنانچہ جب ان کفار کو سزا کے طور پر قتل کیا گیا تو سورۂ انفال (۸) کی آیت ۱۷ میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ: ''تم لوگوں نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا۔''

دین مکمل ہو گیا۔ اب تمام تر ہدایت قرآن، سنت اور حدیث میں ہے۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ چنانچہ اب وحی و الہام کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اب وحی کے ذریعے سے کسی مذہبی رہنما کو اللہ کی طرف سے کوئی پیغام نہیں مل سکتا کہ اس کے دعوتی کام سے اتمام حجت کا عمل مکمل ہو گیا ہے، فلاں مدعو یا مخاطب گروہ کے اندر ایمان قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی اور وہ ہجرت کر جائے۔ لاریب، یہ سارے معاملات رسول اللہ کے ساتھ خاص تھے۔ اب کوئی عالم دین کسی کو کیسے کافر کہہ سکتا ہے؟ ان نکات پر بھی علمی تحقیقات ہونی چاہییں۔ شاید مسئلے کی ایک اہم وجہ اور حل اسی میں پوشیدہ ہو۔

—— محمد بلال

سانحۂ بادامی باغ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدمہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ایسی غیر معمولی کشش رکھتی ہے کہ بے تعصب غیر مسلم بھی آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سکھ شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے کہا:

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں

صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

غیر مسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے محض جذباتی قسم کی محبت رکھ سکتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک محبوب ہی نہیں، بلکہ واجب الاطاعت ہادی بھی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

''ہم نے رسولوں کو اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے۔'' (النساء ۴: ۶۴)

''اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو رائیگاں نہ کرو۔''

(محمد ۴۷: ۳۳)

لیکن یہ بادامی باغ کے مسلمانوں نے کیا کیا۔ بے گناہ مسیحی بھائیوں پر ایسا ظلم کر ڈالا۔ پوری جوزف کالونی پر حملہ کر دیا۔ ان کے سینکڑوں گھروں کو آگ لگا دی۔ وہ بے چارے جان بچانے کے لیے اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور اس میں ان شریف شہریوں کا جرم بھی کم نہیں، جنھوں نے یہ ظلم ہونے دیا اور ظالموں کا ہاتھ نہیں روکا، جبکہ اس وقت مبینہ طور پر توہین رسالت کا مرتکب ساون مسیح پولیس کی حراست میں تھا۔ ان موروثی مسلمانوں نے رسول کے نام پر رسول ہی کی نافرمانی کر ڈالی اور نافرمانی بھی ایسی جو سرکشی پر مبنی ہے۔ انھوں نے زمین پر وہ فساد برپا کیا جس کا اندیشہ تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے فرشتوں نے ظاہر کیا تھا۔ اور یہ وہ فساد ہے جس کی سورۂ مائدہ (۵) میں انتہائی سخت سزا بیان کی گئی ہے:

''ان لوگوں کی سزا، جو اللہ اور رسول سے بغاوت کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں، بس یہ ہے کہ تقتیل (عبرت ناک طور پر قتل) کر دیے جائیں یا سولی پر لٹکا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیے جائیں۔'' (آیت: ۳۳)

بادامی باغ میں فساد برپا کرنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے قریب ترین مذہب مسیحیت ہے۔ ابتداے اسلام کے وقت جب مکہ میں مشرکین کے مظالم حد سے بڑھنے لگے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو

حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی جہاں ایک عیسائی بادشاہ (نجاشی) کی حکومت تھی۔اور جس نے صحیح معنوں میں ان مظلوم مسلمانوں کی مدد بھی کی۔اس لحاظ سے مسیحی ہمارے محسن ہوئے۔اسی طرح جب عرب سے متصل رومی مقبوضات اردن، شام اور فلسطین پر ایرانی مجوسیوں کی فتح ہوئی تو عرب کے مسلمان اس پر بہت غمگین ہوئے اور مشرکین خوش۔اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ روم میں پیشین گوئی فرمائی کہ عیسائی رومیوں کو پھر فتح نصیب ہوگی جس سے مسلمانوں کو حوصلہ ملا۔اسلام نے مسلمانوں کو مسیحی خواتین کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی۔ایک زاویے سے سوچیں تو مسلمان اور عیسائی، دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی اولاد ہونے کے باعث آپس میں کزن ہیں۔

بادامی باغ میں فساد برپا کرنے والوں کو یہ اندازہ نہیں کہ انھوں نے رسول کے نام پر یہ جرم کر کے دنیا میں اسلام اور رسول کا تاثر کس قدر خراب کیا ہے۔ایک پہلو سے دیکھیں تو ان کی یہ حرکت خود گستاخی رسالت کے ذیل میں آتی ہے۔

یہ سادہ سی بات ہے کہ پاکستان مسلمانوں کی ریاست ہے۔مسلمانوں کا حکمران موجود ہے۔سورۂ نساء(۴) میں ہے:

''ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے حکمران ہوں۔''

(آیت:۵۹)

ریاست نے توہین رسالت کا ایک قانون بنا رکھا ہے ـــــ اگرچہ قرآن وحدیث سے اس قانون کے اخذ واستنباط پر اہل علم میں مختلف آرا موجود ہیں ـــــ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی نے توہین رسالت کی ہے تو وہ متعلقہ ریاستی ادارے کے پاس جائے اور ملزم کے خلاف مقدمہ کرے۔پھر عدالت عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے فیصلہ کرے گی کہ توہین رسالت ہوئی ہے یا نہیں۔اور اگر جرم ثابت ہو جاتا ہے تو پھر متعلقہ ادارے اس سزا کا نفاذ کریں گے۔جس طرح کوئی عام شہری کسی چور کو پکڑ کر اس کے ہاتھ نہیں کاٹ سکتا، اگرچہ قرآن میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم موجود ہے ایسے ہی کسی عام شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی گستاخ رسول کو خود سزا دے۔کسی جرم کی سزا خود دینا اقتدار کی اطاعت سے نکلنا ہے۔ہم کسی جنگل میں نہیں رہتے۔اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا ایک نظم اجتماعی، ایک اقتدار اعلیٰ، قوانین کا مجموعہ موجود ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''جو شخص ایک بالشت کے برابر بھی اقتدار کی اطاعت سے نکلا، اور اسی حالت میں مر گیا، اس کی موت جاہلیت پر ہوئی۔'' (بخاری، کتاب الفتن)

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ جاہلیت قبل از اسلام کے دور کو کہا جاتا ہے۔سوچنے والوں کو غور کرنا چاہیے کہ کہیں یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مجرموں کو اسلام سے خارج تو قرار نہیں دے دیا؟

اور معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ کسی مسلم ریاست میں غیر مسلم شہریوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ایک ذمی اور دوسرے معاہد۔ ذمی کسی جنگ کے نتیجے میں اور معاہدین جنگ کے بغیر کسی معاہدے کی رو سے مسلم ریاست کے شہری بنتے ہیں۔ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکمران کی حیثیت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ آپ نے میثاق مدینہ میں وہاں کے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کیا۔ابن ہشام کی ''سیرت النبی'' میں ہے:

''بنی عوف کے یہود اس دستور (میثاق مدینہ) کے مطابق مسلمانوں ہی کی طرح ایک مستقل گروہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔رہا دین کا معاملہ تو یہودی اپنے دین پر رہیں گے اور مسلمان اور ان کے موالی،سب اپنے دین پر۔'' (۲/۱۰۷)

پاکستان کے غیر مسلم شہری معاہدین کے ذیل میں آتے ہیں۔قائداعظم نے ۱۵اگست ۱۹۴۷کو پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ایک پریس کانفرنس میں تمام پاکستانی اقلیتوں سے ان کی زندگی، جائداد، مذہب اور کلچر کے تحفظ کا عہد کیا۔انھیں کسی امتیاز کے بغیر ملک کا شہری قرار دیا۔اور اب بادامی باغ میں فساد برپا کرنے والے دل تھام کر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرامین پڑھ لیں:

''خبردار، جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر ڈالے گا یا اس کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز اس سے لے گا،اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود استغاثہ دائر کروں گا۔'' (ابوداؤد، کتاب الجہاد)

''جو کسی معاہد کو قتل کرے گا،اسے جنت کی بو تک نصیب نہ ہوگی،حالاں کہ اس کی بو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے۔'' (بخاری، کتاب الدیات)

آہ! کس قدر بدقسمت ہے وہ شخص جو خود کو مسلمان سمجھتا ہو،مگر قیامت کے روز اس کے خلاف رسول کا مقدمہ دائر ہو۔

—— محمد بلال

خواتین کا عالمی دن

مغرب میں عورتوں کے مسائل ہماری خواتین سے یکسر مختلف ہیں۔

''عورت دراصل مرد کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے''۔

''عورت جسمانی اور ذہنی طور پر مرد سے کمزور ہے، اسی لیے معاشرے میں اس کا مقام مرد سے کم تر رہا ہے، اور رہے گا''۔

''عورت کا مفاد، کیونکہ مرد سے وابستہ ہے، اس لیے وہ آزادی سے رائے دینے اور قائم کرنے کے لیے نااہل ہے''۔

''عورت کی کارکردگی، کبھی مرد کے برابر نہیں ہوسکتی، اس لیے معاوضے میں بھی اس کی برابری تسلیم نہیں کی جا سکتی''۔

''عورت کی نفسیات میں انفعالیت (Passiveness) ہے، وہ جذبات کا شکار ہو جاتی ہے، اس لیے زندگی کے کسی شعبے میں رہنمائی کے عہدے کے لیے مناسب نہیں''۔

یہ تھے وہ خیالات و نظریات جو عورت کے بارے میں اس مغربی معاشرے میں مانے اور برتے جاتے تھے جہاں اس کے حقوق کی حفاظت کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوا۔ پاپائیت اور آمریت سے بغاوت ہو چکی تھی، مغربی معاشرے میں احیاے علوم کی تحریک (Renaissance) جڑ پکڑ چکی تھی۔ جمہوریت اور ہر قسم کی پابندی سے عاری آزادی اور اظہار راے کا حق تیزی سے عالم گیر سچائیاں بن رہی تھیں۔ چنانچہ عورت کے بارے میں تمام نظریات و خیالات از سر نو مرتب ہونے لگے۔ یہ مانا اور منوایا جانے لگا کہ:

☆ عورت اور مرد کی تخلیق کے پیچھے کوئی ماورائی طاقت نہیں، یعنی کسی خدائی اسکیم سے پیدا نہیں ہوئے، اس لیے یہ غلط ہے کہ عورت، مرد کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

☆ عورت ہر لحاظ سے مرد کے برابر ہے۔ جس طرح مردوں میں بھی کمزور جسم اور کمزور ذہن کی تقسیم ہے اور کمزور مرد انسان ہونے کے ناتے طاقت ور اور جسیم مرد کے برابر تسلیم کیا جاتا ہے، اسی طرح عورت بھی مرد کے برابر ہے، بطور انسان دونوں کا مقام ایک ہے۔

☆ معاشرے میں جب عورت پر مرد کا تسلط ختم ہو جائے گا اور معاشی اور معاشرتی اعتبار سے وہ مرد کی دست نگر بن کر نہیں رہے گی تو وہ بھی آزادی سے راے قائم کرنے کے اہل ہو جائے گی، یہ تقدیر کا نہیں تدبیر کا معاملہ ہے۔

☆ معاوضے کا تعلق کارکردگی اور نتیجہ خیزی (Out put) سے ہے، اس کا تعلق صنف سے نہیں۔ اگر عورت کی کارکردگی کسی مرد سے بہتر ہے تو اسے کم معاوضہ کیوں ملے؟ اس لیے محض جنس کی بنیاد پر معاوضے میں فرق انصاف

اور معیشت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے۔ معاشرتی اقدار سے انسان کی نفسیات بنتی اور تبدیل ہوتی رہتی ہے، معاشرے میں عورت کو کلیدی اور سربراہی اختیارات دیے جائیں تو وہ بھی انفعالیت سے نکل آئے گی۔ یہ کوئی اٹل حقیقت نہیں کہ عورت تخلیقی طور پر انفعالیت پسند (Passive) ہے۔

ان تمام نظریات کو بہت منطقی اور حقیقت پر مبنی قرار دیا گیا۔ پھر اس دور میں عورت کے ساتھ روا ظلم نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ کلیسا عورت کو پیدایشی گناہ گار قرار دیتا ہے، عورت کی حیثیت محض کھلونے کی ہے، وہ انسان کے بجاے ایک قابل خرید و فروخت جنس (commodity) ہے۔ معاشرے میں اس کا کوئی وقار اور مقام نہیں، اگر وہ ملکہ بھی ہے تو بادشاہ سلامت کے دم قدم سے ہے، وہ چاہے تو کسی بھی وقت دوسری ملکہ لے آئے! غرض جس طرح مزدور، کسان اور عام شہری کے حقوق کی حمایت میں اہل فکر و دانش نے اپنا وزن ڈالا، اسی طرح عورت کا بھی ساتھ دیا گیا۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس کے نتیجے میں عورت کو متعدد حقوق ملے مثلاً جائداد میں حصہ، طلاق کا حق، ووٹ کا حق، محنت کی صورت میں برابر معاوضہ، اداروں میں کلیدی عہدوں تک رسائی۔ چنانچہ مغربی معاشرے میں جہاں خواتین کو اب بھی بہت سے مسائل کا سامنا ہے، عمومی طور پر خواتین قابل رشک حد تک معاشرے میں باوقار مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ ذرائع ابلاغ کی بے پناہ ترقی کی وجہ سے دوسرے معاشروں نے بھی اس تحریک سے متاثر ہونا شروع کیا۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی خواتین کو درپیش مسائل کا حل یہی سمجھا جانے لگا کہ ہمیں بھی انھی اصلاحات سے کامیابی مل سکتی ہے جو یورپ نے اختیار کیے ہیں، اور یہیں سے خرابی کا سفر شروع ہوا۔

ہمارے معاشرے میں عورت کا مقام اس مقام سے کہیں منفرد اور مختلف ہے جو اسے مغرب میں حاصل ہے۔ اس کا سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ مغرب میں خواتین کے حقوق کا تحفظ ''اخلاقیات'' سے نہیں، بلکہ ''افادیت'' (Utility) سے کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مغربی معاشرے میں اگر کوئی ماں اپنے بچے کو سزا دینے کے لیے مارتی ہے تو اس کا یہ عمل جرم ہے۔ بیٹا اگر شکایت نہ بھی کرے تو اسٹیٹ ایسی ماں کے خلاف کارروائی کا حق محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے بالکل برعکس ہمارے ہاں ۶ فٹ کا نوجوان اپنی ماں سے بے تحاشا پٹنے کے بعد بھی مذہبی، ثقافتی اور قانونی طور پر ماں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا، بلکہ مذہبی اعتبار سے اسے 'اُف' کہنے کا بھی اختیار نہیں، یعنی وہ اس پٹائی پر ''ناپسندیدگی'' کا اظہار بھی نہیں کر سکتا!

دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ مغربی معاشرہ خدا کے انکار پر کھڑا ہے۔ وہ ایسی کسی چیز کو نہیں مانتا کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مقصد کے لیے بنایا ہے، جبکہ مذہب کا بنیادی مقدمہ ہی یہ ہے کہ یہ دنیا آخرت کے لیے بنی ہے، یہاں

ہم آزمایش کے لیے آئے ہیں۔ مرد وعورت بنیادی طور پر ایک ہی وجود ہیں جن کو علیحدہ علیحدہ تشخص دیا گیا ہے۔ یعنی مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے سکون کے لیے بنائے گئے ہیں۔ لیکن دونوں کے جسمانی تقاضے ایک دوسرے کے برعکس ہیں، اور اسی بنیاد پر ان کی صلاحیتیں، نفسیات، ذہنی استعداد بھی مختلف ہے۔ جیسے ۲۴ گھنٹوں میں دن رات ہیں ایسے مرد وعورت ہیں، جیسے دن اور رات کے اعمال کے تقاضے مختلف ہیں اسی طرح مرد وعورت کے اعمال کے تقاضے مختلف ہیں۔

مذہب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح انسان کا بدن اور لباس صاف ہونا چاہیے، اسی طرح اس کی روح بھی صاف اور پاک ہونی چاہیے، اس مقصد کے لیے مرد وعورت کو اس نے اپنی جذباتی آسودگی کے لیے میاں بیوی کے بندھن میں باندھا ہے اور حکم دیا ہے کہ وہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہیں اور ان کا گھر معاشرے کی بنیادی اکائی (Unit) ہوگا۔ یہ گھر گویا ایک چھوٹا سا ادارہ ہے اور اس ادارے کا سربراہ اس نے مرد کو قرار دیا ہے، عورت کو نہیں۔ اس کے بالکل برعکس یورپ کی ملحد سوسائٹی (godless Society) میں اس کا کوئی تصور نہیں۔ وہاں کسی بھی مرد یا عورت پر اخلاقاً یا قانوناً کوئی قدغن نہیں کہ وہ شادی کے بغیر جذباتی آسودگی کے ذرائع اختیار کرے۔

معاشرے کی بنیادی خصوصیات میں یہ وہ عظیم فرق ہے جس کی وجہ سے دونوں معاشروں کے مسائل کا حل ایک سا تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ بات کو دو اور دو چار کی طرح سمجھنے کی خاطر عرض ہے کہ اس سال خواتین کا عالمی دن منانے کے لیے جس مسئلے کو بطور خاص نمایاں کیا اس کا تعلق خواتین پر تشدد ہے۔

مغرب اس حوالے سے قانونی سی بات کرتا ہے کہ کسی بھی حوالے سے کسی بھی عورت پر جسمانی یا ذہنی تشدد نہیں کیا جا سکتا، لیکن ہمارے معاشرے میں یہ بات اس طرح علی الاطلاق نہیں کی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اگر ماں کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ بیٹے کو سزا کی خاطر تھپڑ مارلے تو باپ کو بھی اجازت دیتے ہیں کہ بیٹی کو بھی کسی سنجیدہ نافرمانی پر تھپڑ مار سکتا ہے، ہم میاں کو بھی یہ اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ گھر کی بات گھر تک رکھنے کے لیے، گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے بیوی کو کسی انتہائی نافرمانی سے بچانے کی خاطر ڈانٹ ڈپٹ کر لے، غیر متشدد سزا دے ڈالے یا کوئی اور مناسب راستہ اختیار کرے۔ ہمارا معاشرہ اپنی ترجیحات کے مطابق معاملہ کرے گا اور مغرب میں اختیار کیے گئے اقدامات یہاں فائدہ کے بجائے نقصان دہ ہوں گے۔

اس طرح ہمارا معاشرہ میاں بیوی کے حقوق کے حوالے سے بہت واضح ہے کہ گھر کی اقتصادیات کی ساری

ذمہ داری مرد پر ہے، عورت پر سرے سے کوئی ذمہ داری ہی نہیں۔ اس لیے اگر مرد اس ذمہ داری کو بطریق احسن پوری کر رہا ہے اور عورت اس پر بضد ہے کہ وہ اپنی ذاتی حیثیت میں کوئی ملازمت یا کاروبار کرنا چاہتی ہے تو اس کا شوہر اسے روک سکتا ہے، جبکہ مغرب میں یہ اقدام عورت کے حقوق پر ڈاکا ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے معاشرے کی ضرورتوں اور حکمتوں کے مطابق معاشرے کی اصلاح کا کام کریں، ہمیں دوسروں کے کامیاب ''نسخوں'' پر ریجھنے کے بجاے یہ دیکھنا چاہیے کہ ان نسخوں کی دوا ہمارے 'جسم' کے لیے موافق بھی ہے یا نہیں...... البتہ ایک چیز بالکل واضح ہے کہ حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہے، یہ اگر عقل وخرد اور اخلاق کے مطابق ہے تو اسے ہر جگہ سے لیا جا سکتا ہے۔

—— نعیم احمد بلوچ

البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ التوبہ

(۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

عَفَا اللّٰهُ عَنۡكَ لِمَ اَذِنۡتَ لَهُمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَتَعۡلَمَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۴۳﴾

اللہ تم کو معاف کرے (اے پیغمبر)، تم نے (اِس سفر سے) اِنھیں رخصت کیوں دے دی؟ (تمھیں چاہیے تھا کہ ایسا نہ کرتے)، یہاں تک کہ تم پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔[۲۰۲]

۲۰۲؎ تبوک کے موقع پر جہاد کے لیے نفیر عام کا اصلی مقصد یہی تھا کہ جزا و سزا کے اِس مرحلے میں منافقین کے چہرے سے بھی نقاب الٹ دی جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کریم النفسی اور چشم پوشی اُن کے آڑے آئی اور آپ نے یہ جاننے کے باوجود کہ جو عذرات وہ پیش کر رہے ہیں، سب جھوٹے ہیں، اُنھیں قبول کر لیا اور رخصت دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہایت دل نواز اسلوب میں آپ کو اِس پر توجہ دلائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... بات کا آغاز ہی عفو کے اعلان سے فرمایا کہ واضح ہو جائے کہ مقصود سرزنش اور عتاب نہیں، بلکہ توجہ دلا دینا ہے کہ منافقین تمھاری کریم النفسی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تم اپنی چشم پوشی کی وجہ سے اُن کے عذرات کو لاطائل سمجھنے کے باوجود اُن کو اجازت دے دیتے ہو جس سے وہ دلیر ہو جاتے ہیں کہ اُن کی مکاری کامیاب ہو گئی، حالاں کہ اگر تم اجازت نہ دیتے تو اُن کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اُن کے جھوٹوں اور سچوں میں امتیاز ہو جاتا۔ تمھاری اجازت کے بغیر جو گھر میں بیٹھ رہتے، ہر شخص پہچان جاتا کہ یہ منافق ہیں، لیکن وہ تمھاری اجازت کو اپنے چہرے کی

لَا یَسۡتَاۡذِنُکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ اَنۡ یُّجَاہِدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَاَنۡفُسِہِمۡ
وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا یَسۡتَاۡذِنُکَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ
وَارۡتَابَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ فَہُمۡ فِیۡ رَیۡبِہِمۡ یَتَرَدَّدُوۡنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوۡ اَرَادُوا الۡخُرُوۡجَ لَاَعَدُّوۡا
لَہٗ عُدَّۃً وَّلٰکِنۡ کَرِہَ اللّٰہُ انۡۢبِعَاثَہُمۡ فَثَبَّطَہُمۡ وَقِیۡلَ اقۡعُدُوۡا مَعَ الۡقٰعِدِیۡنَ ﴿۴۶﴾
لَوۡ خَرَجُوۡا فِیۡکُمۡ مَّا زَادُوۡکُمۡ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡ اَوۡضَعُوۡا خِلٰلَکُمۡ یَبۡغُوۡنَکُمُ
الۡفِتۡنَۃَ وَفِیۡکُمۡ سَمّٰعُوۡنَ لَہُمۡ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابۡتَغَوُا الۡفِتۡنَۃَ مِنۡ

جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر سچا ایمان رکھتے ہیں، وہ کبھی تم سے اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد سے رخصت مانگنے نہیں آئیں گے۔ اللہ اُن کو خوب جانتا ہے (جن کے عذر حقیقی ہیں اور) جو اُس سے ڈرنے والے ہیں۔ تم سے رخصت مانگنے تو وہی آتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، سو اپنے اِسی شک میں بھٹک رہے ہیں۔ اگر وہ نکلنا چاہتے تو ضرور کچھ سامان کرتے، لیکن اللہ نے اُن کا اٹھنا پسند نہیں کیا، اِس لیے اُنھیں روک دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔[۲۰۳] ۴۳-۴۶

(حقیقت یہ ہے کہ) اگر یہ لوگ تمھارے اندر شامل ہو کر نکلتے تو تمھارے لیے خرابی ہی بڑھانے کا باعث بنتے اور اِن کی سب دوڑ دھوپ تمھارے درمیان فتنہ انگیزی کے لیے ہوتی۔ تمھارے اندر ایسے بھی ہیں جو اِن کی سن لیتے ہیں۔[۲۰۴] اللہ اِن ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اِنھوں نے پہلے بھی فتنہ انگیزی کی

نقاب بنا لیتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۸۳)

۲۰۳؎ یہ توفیق کے باب میں سنت الٰہی کا بیان ہے اور اسلوب طنزیہ ہے۔ آگے کی بعض آیتوں میں یہ طنز اور بھی تیز ہو گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جب تم نے اٹھنا پسند نہیں کیا تو خدا نے بھی تمھیں اِس کی توفیق نہیں دی، بلکہ یہی پسند کیا کہ جاؤ گھروں میں بیٹھنے والے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کی طرح تم بھی بیٹھے رہو۔ تمھارے لیے یہی موزوں ہے۔

۲۰۴؎ یہ اُن سادہ لوح مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے جن کی سادہ لوحی کے سبب سے منافقین بالعموم اُنھیں چکما

قَبۡلُ وَقَلَّبُوۡا لَکَ الۡاُمُوۡرَ حَتّٰی جَآءَ الۡحَقُّ وَظَہَرَ اَمۡرُ اللّٰہِ وَہُمۡ کٰرِہُوۡنَ ﴿۴۸﴾
وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّیۡ وَلَا تَفۡتِنِّیۡ اَلَا فِی الۡفِتۡنَۃِ سَقَطُوۡا وَاِنَّ جَہَنَّمَ

کوشش کی ہے اور تمھارے لیے معاملات کا الٹ پھیر کرتے رہے ہیں[205]، یہاں تک کہ اِن کی مرضی کے خلاف حق آیا اور اللہ کا حکم ظاہر ہو گیا۔ ۴۷-۴۸

اِن میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے رخصت دیجیے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالیے[206] ——— سن لو، یہ

دینے میں کامیاب ہو جاتے اور اِس طرح فتنہ انگیزی کے لیے کچھ نہ کچھ راستہ نکال لیتے تھے۔

۲۰۵؎ قرآن کے مخاطبین اِن سب چیزوں سے واقف تھے، اِس لیے اُس نے صرف اجمالی اشارہ کر دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”...یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ بدر کے موقع پر... اللہ اور رسول کا منشا واضح ہونے کے باوجود مسلمانوں کو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنے کی راہ سجھانے کی کوشش کی، اِنھی لوگوں نے جنگ احد کے موقع پر پہلے تو شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا، پھر جب اِن کا مشورہ قبول نہیں ہوا تو عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر عین موقع پر الگ ہو گیا۔ پھر جنگ کے بعد اسی کے ہم خیالوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا کہ نعوذ باللہ آپ قوم کے بدخواہ ہیں کہ خیر خواہوں کے مشورے کے خلاف ایک غلط مقام پر لے جا کر ہمارے بھائیوں کو کٹوا دیا اور شکست کا سبب بنے۔ پھر یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ مریسیع کے موقع پر اپنی فتنہ انگیزی سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان تلوار چلتے چلتے رہ گئی۔ اِسی سلسلے میں اِن کی ایک نہایت سنگین شرارت واقعۂ افک کی شکل میں ظاہر ہوئی جو بات کا بتنگڑ بنانے کی ایک نہایت گھنونی مثال ہے۔ حنین کے موقع پر تقسیم غنیمت کے معاملے میں اِنھوں نے اپنی بدطینتی سے دلوں میں سخت کدورت پیدا کر دینے کی کوشش کی۔ غرض جو موقع بھی اِن کے ہاتھ آیا، اُس سے فائدہ اٹھا کر اِنھوں نے مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈلوانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۵۸۵)

۲۰۶؎ یعنی روم جانے کے لیے نہ کہیے کہ مبادا وہاں کوئی فتنہ ہمیں اپنی گرفت میں لے لے۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ اِس سے اُن کی مراد رومی عورتوں کے حسن و جمال کا فتنہ تھا۔* یہ اُسی طرح کا عذر ہے، جیسا کہ بعض

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/ ۴۷۵۔

لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا
قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ
اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ
اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ

فتنے میں پڑ چکے[۲۰۷] اور (اب) دوزخ اِن منکروں کو گھیرے ہوئے ہے[۲۰۸]۔ اگر تمھیں کوئی اچھائی پیش آتی ہے تو اِنھیں دکھ ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ (خوب ہوا)، ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور خوش خوش لوٹتے ہیں[۲۰۹]۔ اِنھیں بتا دو کہ ہمیں وہی چیز پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ اِن سے کہہ دو کہ تم ہمارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہو، وہ اِس کے سوا کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے[۲۱۰]۔ لیکن

مدعیان تقویٰ مسجد کی حاضری سے متعلق پیدا کر لیتے ہیں کہ گھر ہی میں نماز پڑھ لیتے ہیں، اِس لیے کہ وہاں جائیں گے تو ریا کے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اگرچہ یہ عذر پیش تو ایک آدھ احمقوں نے ہی کیا ہوگا، لیکن یہ عذر کی ایک ایسی قسم تھی جس پر تقویٰ اور دین داری کا ملمع چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی، اِس وجہ سے قرآن نے اِس کا خاص طور پر ذکر فرمایا تاکہ مسلمانوں کو شیطان کے ایک خاص حربے سے آگاہ کر دیا جائے کہ کبھی کبھی وہ تقویٰ کے بھیس میں بھی حملہ آور ہوتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۸۶)

۲۰۷؎ نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تبوک جانا تو دور کی بات ہے، اپنی بد عملی پر فریب کاری کا یہ ملمع چڑھا کر اور اِس طرح کے عذرات پیش کر کے یہ گھر بیٹھے ہی فتنے میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

۲۰۸؎ اِس سے دو باتیں واضح ہوئیں: ایک یہ کہ اِس قسم کے تمام بہانے تراشنے والے اگرچہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے ہیں، مگر درحقیقت منکر ہیں۔ دوسری یہ کہ تبوک کے سفر سے تو یہ اِس طرح کی بہانہ سازی سے بچ سکتے ہیں، لیکن خدا کی دہکائی ہوئی جہنم سے نہیں بچ سکتے۔ یہ جہاں چاہیں، بھاگ کر دیکھ لیں، وہ ہر طرف سے اِن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۲۰۹؎ یہ اُسی کفر سے پردہ اٹھایا ہے جس کا ذکر پیچھے ہوا کہ اِن کے سینے ایمان سے خالی ہیں، اِس لیے کہ اِن کے

اَوْ بِاَیْدِیْنَا فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا لَّنْ یُّتَقَبَّلَ مِنْکُمْ اِنَّکُمْ کُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ کُسَالٰی وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ کٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْکَ

ہم تمھارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ تم پر اپنے ہاں سے عذاب بھیجے گا یا ہمارے ہاتھوں سے[۲۱۱]۔ سو انتظار کرو، ہم بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہیں۔ ۴۹-۵۲

(اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے یہ کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں)، (اِن سے) کہہ دو: تم اپنے مال خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، وہ تم سے ہرگز قبول نہ کیے جائیں گے، اِس لیے کہ تم بدعہد لوگ ہو۔ اِن کا انفاق درخور قبول نہیں ہے تو اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اِنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول سے کفر کیا ہے[۲۱۲] اور نماز کے لیے آتے ہیں تو مارے باندھے آتے ہیں اور خرچ

دلوں میں تو مسلمانوں کے لیے اِس درجے کی بدخواہی بھری ہوئی ہے۔

۲۱۰؎ یعنی جس سفر کے لیے نکل رہے ہیں، اُس میں کامیابی یا ناکامی۔ یہ دونوں ہمارے لیے بھلائی ہیں۔ اِس لیے کہ پہلی چیز حاصل ہوئی تو اپنے پروردگار کا شکر ادا کریں گے جس کے بعد ازدیاد نعمت کی توقع ہے اور دوسری چیز سے دوچار ہوئے تو صبر و استقامت کے ساتھ اور توبہ و انابت کے جذبے سے اپنی کمزوریوں کی اصلاح کریں گے جس کے نتیجے میں امید ہے کہ دنیا اور آخرت، دونوں میں خدا کی رحمت و عنایت شامل حال ہو جائے گی۔

۲۱۱؎ اِس کتاب میں کئی جگہ بیان ہو چکا ہے کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد خدا کا عذاب بالعموم اِنھی دو صورتوں میں آتا ہے۔ رسول کے ساتھی تعداد میں کم ہوں اور اُنھیں کوئی دارالہجرت بھی میسر نہ ہو سکے تو ابر و باد کے لشکر منکرین کو تباہ کر دیتے ہیں۔ وہ معتد بہ تعداد میں ہوں اور کسی سرزمین میں اُن کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان بھی ہو جائے تو اُن کی تلواریں بے نیام ہوتی ہیں اور منکرین حق کا استیصال کر دیتی ہیں۔

۲۱۲؎ یعنی حقیقت میں کفر کیا ہے، اِس لیے کہ اللہ و رسول پر ایمان کے جو تقاضے ہیں، یہ اُن میں سے کسی کو بھی پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا

کرتے ہیں تو بادل ناخواستہ خرچ کرتے ہیں۔ سو اِن کے مال و اولاد کو کچھ وقعت نہ دو۔[۲۱۳] اللہ تو (اب) یہ چاہتا ہے کہ اِن کے ذریعے سے اِنھیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور اِن کی جانیں اِس حالت میں نکلیں کہ یہ کافر ہوں۔[۲۱۴] ۵۳-۵۵

یہ خدا کی قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلاتے ہیں کہ تم میں سے ہیں، دراں حالیکہ یہ تم میں سے نہیں ہیں، بلکہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے ہیں۔[۲۱۵] اگر یہ کوئی ٹھکانا، کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تو رسی تڑا کر اُدھر بھاگ کھڑے ہوتے۔[۲۱۶] ۵۶-۵۷

اِن میں ایسے بھی ہیں، (اے پیغمبر) جو صدقات[۲۱۷] (کی تقسیم) کے معاملے میں تم پر عیب لگاتے

۲۱۳؎ یعنی اِس بنا پر اِن سے دین کی کسی سچی خدمت کی توقع نہ کرو، اِس لیے کہ یہ مال و اولاد اِن کے لیے آخرت میں کسی بڑے مرتبے کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ غلامی کا پھندا ہے۔ اپنی گردنیں یہ اب اِس پھندے سے چھڑا نہ سکیں گے۔

۲۱۴؎ اللہ کا یہ چاہنا اُس سنت کے مطابق ہے جو اُس نے لوگوں کی ہدایت اور گمراہی کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اِس کی وضاحت ہم پیچھے ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔

۲۱۵؎ یعنی اِس بات سے ڈرتے ہیں کہ تم سے الگ ہو گئے تو اُسی انجام کو پہنچا دیے جائیں گے جو اِس سے پہلے کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے لیے بیان ہو چکا ہے۔

۲۱۶؎ یعنی جانتے ہیں کہ اب فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا، ورنہ بھاگ کر کہیں پناہ لے چکے ہوتے۔

۲۱۷؎ اِن میں زکوٰۃ بھی شامل ہے، مگر یہ لفظ اُس کی نسبت عام ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ ۙ وَقَالُوۡا
حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُـؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَرَسُوۡلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوۡنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ
لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّـفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِى الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ
وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۰﴾

ہیں۔ (یہ وہ لوگ ہیں جنھیں لالچ نے تمھارے ساتھ باندھ رکھا ہے[۲۱۸])۔ چنانچہ اگر اُس مال میں سے اِنھیں دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ (اِن کے لیے کہیں بہتر ہوتا)، اگر یہ اُس پر راضی رہتے جو اللہ اور اُس کے رسول نے اِنھیں دیا تھا اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے[۲۱۹]۔ اللہ آگے اپنے فضل سے ہم کو بہت کچھ دے گا اور اُس کا رسول بھی۔ ہمیں تو اللہ چاہیے۔ (اِنھیں بتا دو کہ) صدقات تو درحقیقت فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور اُن کے لیے جو اُن کے نظم پر مامور ہوں، اور اُن کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ نیز اِس لیے کہ گردنوں کے چھڑانے میں اور تاوان زدوں کے سنبھالنے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کی بہبود کے لیے خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے[۲۲۰]۔ ۵۸-۶۰

”... اِس میں وہ تمام عطایا شامل ہیں جو بہ نیت اجر و ثواب دیے جائیں۔ عام اِس سے کہ وہ زکوٰۃ کا مال ہو یا انفاق و تبرع کی نوعیت کا کوئی اور مال۔ چونکہ اِسی انفاق سے آدمی کے ایمان کی صداقت اور پختگی واضح ہوتی ہے، اِس وجہ سے اِس کو صدقہ کہتے ہیں جس کی اصل 'صدق' ہے جس کی روح قول و فعل کی کامل مطابقت اور رسوخ و استحکام ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۹۱)

۲۱۸؎ اوپر مال دار منافقین کا ذکر تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ اِنھیں خوف نے تمھارے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ اب یہ اُن منافقین کا ذکر ہو رہا ہے جو مال دار نہیں تھے۔

۲۱۹؎ یہ شرطیہ جملہ ہے جس کی جزا اصل میں حذف کر دی گئی ہے تاکہ وہ شدت نمایاں ہو جائے جو متکلم اِس جملے سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ عربی زبان میں یہ اسلوب اِسی طریقے سے زجر، شفقت، حسرت و ملامت اور التفات و عنایت کے پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے لیے بھی اختیار کیا جاتا ہے۔

۲۲۰؎ مطلب یہ ہے کہ بیت المال میں جو صدقات جمع ہوتے ہیں، وہ اُن مصارف کے لیے خاص ہیں جو نظم اجتماعی کی ضرورتوں اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُنھیں خدا نے اپنے علم و حکمت سے مقرر فرمایا ہے، لہٰذا صدقات اُنھی میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ یہ مال کے حریص ناخواندہ مہمانوں کے لیے نہیں ہیں اور نہ اُن کی خواہشوں کے مطابق تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

آیت میں جو مصارف بیان ہوئے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

فقرا و مساکین کے لیے۔ فقیر کا لفظ اُس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسروں کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ غنی کا مقابل ہے اور ہر قسم کے حاجت مندوں کے لیے عام ہے۔ مسکین اِس کے مقابل میں سخت ہے۔ مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بے بسی اور بے چارگی شامل ہے۔ اِس اعتبار سے مسکین اُسے کہا جائے گا جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہو۔

'العاملین علیہا'، یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔ اِس لیے کہ ریاست کے تمام ملازمین درحقیقت 'العاملین علی اخذ الضرائب و ردھا الی المصارف' ہی ہوتے ہیں۔ 'متصدقین' یا اِس طرح کے بعض دوسرے الفاظ کے بجاے قرآن نے یہ لفظ اِسی مدعا کو ادا کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔

'المؤلفة قلوبهم'، یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات کے لیے۔

'فی الرقاب'، یعنی ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے۔

'الغارمین'، یعنی کسی نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے۔

'فی سبیل اللّٰه'، یعنی دین کی خدمت اور لوگوں کی بہبود کے کاموں میں۔

'ابن السبیل'، یعنی مسافروں کی مدد اور اُن کے لیے سڑکوں، پلوں، سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ زکوٰۃ اور دوسرے تمام صدقات جس طرح فرد کے ہاتھ میں دیے جا سکتے ہیں، اُسی طرح اُس کی بہبود کے کاموں میں بھی خرچ کیے جا سکتے ہیں۔ اِن کے مصارف پر تملیک ذاتی کی جو شرط بالعموم عائد کی جاتی ہے، اُس کے لیے کوئی ماخذ قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''ہمارے فقہا کا ایک گروہ 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' کے 'ل' کو تملیک ذاتی کے مفہوم کے لیے خاص کرتا ہے اور پھر اِس سے یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ صدقات و زکوٰۃ کی رقوم فقرا و مساکین کی کسی ایسی اجتماعی بہبود پر صرف نہیں ہو سکتیں جس سے ملکیت ذاتی تو کسی کی بھی قائم نہ ہو، لیکن اُس کا فائدہ بحیثیت مجموعی سب کو پہنچے۔ ہمارے

نزدیک یہ راے کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اول تو 'ل' کچھ تملیک ہی کے معنی کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ یہ متعدد معانی کے لیے آتا ہے اور اِن سب معانی کے لیے یہ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے، تملیک ذاتی ہی کے معنی کے لیے اِس کو خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آخر بہبود، نفع رسانی اور استحقاق کے معانی کے لیے بھی جب اِس کا استعمال معروف ہے تو اِن معانی میں یہ کیوں نہ لیا جائے؟ پھر آیت میں آپ نے دیکھا کہ بعض چیزیں 'فی' کے تحت بیان ہوئی ہیں اور 'فی' کا متبادر مفہوم تملیک نہیں، بلکہ خدمت، مصرف، رفاہیت اور بہبود ہی ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/۵۹۳)

[باقی]

معز امجد

ترجمہ: شاہد رضا

فلاح آخرت کے لیے جد و جہد کرنے والوں کے لیے انعامات الٰہی

رُوِیَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ کَانَتِ الدُّنْیَا ھَمَّہُ، فَرَّقَ اللّٰہُ عَلَیْہِ أَمْرَہُ وَجَعَلَ فَقْرَہُ بَیْنَ عَیْنَیْہِ وَلَمْ یَأْتِہِ مِنَ الدُّنْیَا إِلَّا مَا کُتِبَ لَہُ. وَمَنْ کَانَتِ الْآخِرَۃُ نِیَّتَہُ، جَمَعَ اللّٰہُ لَہُ أَمْرَہُ وَجَعَلَ غِنَاہُ فِیْ قَلْبِہِ وَأَتَتْہُ الدُّنْیَا وَھِیَ رَاغِمَۃٌ.

روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کا مقصود صرف دنیا ہو[1]، اللہ تعالیٰ اس پر اس کے معاملات منتشر کر دے گا اور اس کے چہرے پر پریشانی ڈال دے گا[2] اور اس کو دنیوی فوائد سے بہرہ ور نہیں کرے گا، سوائے اس کے کہ جو اس کے لیے لکھ دیا گیا ہے[3]۔ (تاہم) جس شخص کا مطمح نظر آخرت میں حصول انعامات ہو[4]، اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کے معاملات کو منظّم کر دے گا اور اس کے دل کو اطمینان بخشے گا[5] اور اس کو دنیوی فوائد سے بہرہ ور کرے گا، جبکہ وہ ان فوائد کو حقیر

سمجھے۔[6]

ترجمے کے حواشی

۱۔ سچا اور صاحب عقل مومن روز محشر، روز قیامت اور ابدی جزا یا ابدی سزا پر ایمان لانے کے بعد اس عارضی زندگی کو اپنا مقصود و مطلوب نہیں بنا سکتا۔

۲۔ اپنی نوعیت میں آزمایش ہونے کی حیثیت سے، دنیوی زندگی متعدد اتار چڑھاؤ لاتی ہے۔ چنانچہ جو شخص محض اس دنیا کی کامیابی اور مال کے لیے زندگی گزارتا ہے، وہ دلی طور پر مطمئن اور پر سکون نہیں رہ سکتا۔

۳۔ یہاں تک کہ جس شخص کا مقصود اور توجہ صرف اس دنیا کے فوائد حاصل کرنے پر ہو، وہ صرف وہی حاصل کر سکے گا جس کا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے حکم صادر فرمایا ہے۔ ایک قسم کی آزمایش ہونے کی حیثیت سے، یہ زندگی عموماً ہماری مساعی کے مطابق نتائج برآمد نہیں کرتی۔ جس شخص کا مقصود محض اس دنیا کے فوائد کا حصول ہو، اس قسم کی زندگی اس کے لیے مزید مایوسیوں کا باعث بنتی ہے۔

۴۔ اس کے برعکس، یہ وہ شخص ہے جو اس قسم کی زندگی سے باخبر ہوتا ہے، اس لیے اس کا مطمح نظر صرف آخرت کے نتائج ہوتا ہے جو کہ یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ ابدی بھی ہوتے ہیں۔ تاہم، اس بات کو ذہن نشین ہونا چاہیے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ شخص اس دنیوی زندگی میں انعامات الٰہیہ میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتا۔ اس طرح کی روایات کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ملاحظہ کریں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں ان لوگوں کا بیان ہے جو آخرت میں حقیقی کامیابی کے لیے آنکھیں بند کیے بغیر اس دنیا میں انعامات الٰہیہ کے متلاشی ہوتے ہیں۔ ان دو قسم کے لوگوں کا قرآن مجید نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ.
(البقرہ ۲: ۲۰۱-۲۰۲)

’’بعض وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار، ہمیں اس دنیا میں اچھی چیزیں عطا فرما اور (نتیجتاً) ان کے لیے آخرت میں انعامات الٰہیہ کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ (اس کے برعکس) ان میں بعض وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار، ہمیں اس دنیا میں بھی اپنے انعامات سے نواز اور

آخرت میں بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ
فرما۔اور (جس روز اللہ تعالیٰ لوگوں میں فیصلہ فرمائے
گا) یہی وہ لوگ ہوں گے جو اپنی کمائی کے مطابق
(انعام کے طور پر) حصہ پائیں گے۔اور (یاد رکھو)
اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔''

اس رویے کے نتیجے میں، کسی شخص کو اپنے مقاصد و منازل کے حصول سے آسانی سے گمراہ نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ وہ شخص جس کی آنکھوں کا محور آخرت ہو، اور وہ دنیوی زندگی کی نوعیت سے متنبہ بھی ہو تو وہ زندگی کے اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنے میں امید کے دامن کو نہیں چھوڑتا۔ اس حقیقت کو جان کر وہ ہمیشہ پرسکون رہتا ہے کہ آخرت میں اس کی کوششیں ضرور ثمر بار ہوں گی اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سایۂ رحمت سے نوازے گا، جب اسے سب سے زیادہ ضرورت اسی کی ہوگی۔

۶۔ خواہ فائدہ ہو یا نقصان، جس شخص کی جدوجہد کا مرکز آخرت ہوگی، وہ ان کو اپنی آزمایش کا ایک حصہ سمجھے گا۔ نتیجتاً، دنیا کا بڑے سے بڑا نقصان بھی اس کو ناامید نہیں کر سکتا، اور دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی بھی اس کو غرور و تکبر میں مبتلا نہیں کر سکتی۔

بنیادی سبق

دنیوی زندگی ایک آزمایش ہے، اور اس کے فوائد و نقصانات بھی عارضی ہیں۔ جو شخص اس حقیقت کو بھول جاتا ہے اور فقط اس زندگی کی فلاح کا خواہش مند ہو، وہ پریشان کن زندگی گزارتا ہے، یہاں تک کہ اس کی دنیوی دولت جمع کرنے کی کوششیں اس کے لیے صرف اتنا ہی سکون کا باعث بنتی ہیں، جتنا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے حکم فرمایا ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص اس حقیقت کا احساس رکھتا ہے اور اس سے آگاہ ہے، اس کا مطمح نظر آخرت کی فلاح و کامیابی ہوتا ہے۔ وہ نہ تو اس دنیا کی ناکامیوں سے پریشان ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی کامیابیوں سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔ وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے وعدۂ رحمت و عدل سے مطمئن رہتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے دنیوی حصے سے کوئی بھی اس کو محروم نہیں کر سکتا۔

متون

بعض اختلافات کے ساتھ یہ روایت ابن ماجہ، رقم ۴۱۰۵؛ ترمذی، رقم ۲۴۶۵؛ ابن حبان، رقم ۶۸۰؛ دارمی، رقم ۲۲۹ اور احمد، رقم ۲۱۶۳۰ میں روایت کی گئی ہے۔

بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۲۴۶۵ میں مذکور حکم، جس میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، اس کے برعکس ہے۔

بعض روایات، مثلاً ابن حبان، رقم ۶۸۰ میں 'من كانت الدنيا همه' (جس کا مقصود صرف دنیا ہو) کے الفاظ کے بجائے 'من كانت الدنيا نيته' (جس کی نیت صرف دنیا ہو) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۱۶۳۰ میں یہ الفاظ 'من كانت نيته الدنيا' (جس کی نیت صرف دنیا ہو) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۲۴۶۵ میں 'فرق اللّٰه عليه أمره' (اللہ تعالیٰ اس پر اس کے معاملات منتشر کر دے گا) کے الفاظ کے بجائے 'فرق عليه شمله' (اللہ تعالیٰ اس کے اتحاد کو منتشر کر دے گا) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۲۴۶۵ میں 'فرق اللّٰه عليه أمره و جعل فقره بين عينيه' (اللہ تعالیٰ اس پر اس کے معاملات منتشر کر دے گا اور اس کے چہرے پر پریشانی ڈال دے گا) کے الفاظ کے بجائے 'جعل اللّٰه فقره بين عينيه و فرق عليه شمله' (اللہ تعالیٰ اس کے چہرے پر پریشانی ڈال دے گا اور اس کے اتحاد کو منتشر کر دے گا) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۱۶۳۰ میں یہ الفاظ 'فرق اللّٰه عليه ضيعته' (اللہ تعالیٰ اس کی دولت کو منتشر کر دے گا) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً دارمی، رقم ۲۲۹ میں 'جعل فقره بين عينيه' (وہ اس کے چہرے پر پریشانی ڈال دے گا) کے بجائے 'جعل فرقه بين عينيه' (وہ اس کے چہرے پر انتشار ڈال دے گا) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۲۴۶۵ میں 'إلا ما كتب له' (سوائے اُس کے جو اس کے لیے لکھ دیا گیا ہے) کے الفاظ کے بجائے 'إلا ما قدر له' (سوائے اُس کے جو اس کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۲۴۶۵ میں 'من كانت الآخرة نيته' (جس شخص کا مطمح نظر آخرت میں

حصول انعامات ہو) کے الفاظ کے بجاے 'من کانت الآخرة همه' (جس شخص کا مقصود آخرت ہو) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۱۶۳۰ میں یہ الفاظ 'من کان همه الآخرة' (جس شخص کا مقصود آخرت ہو) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً دارمی، رقم ۲۲۹ میں 'جمع اللّٰه له أمره' (اللہ تعالیٰ اس کے معاملات کو اس کے لیے منظّم کردے گا) کے الفاظ کے بجاے 'جمع اللّٰه له شمله' (اللہ تعالیٰ اس کے اتحاد کو اس کے لیے منظّم کردے گا) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۱۶۳۰ میں یہ الفاظ 'جمع اللّٰه شمله' (اللہ تعالیٰ اس کے اتحاد کو منظّم کردے گا) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۱۶۳۰ میں یہ الفاظ بعض دیگر احکام کے اضافے کے ساتھ اس طرح روایت کیے گئے ہیں:

نضر اللّٰه إمرءً سمع منا حديثًا فحفظه حتى يبلغه غيره فإنه رب حامل فقه ليس بفقيه ورب حامل فقه إلى من هو أفقه منه. ثلاث خصال لا يغل عليهن قلب مسلم أبدًا: إخلاص العمل للّٰه ومناصحة ولاة الأمر ولزوم الجماعة فإن دعوتهم تحيط من وراء هم وقال: من كان همه الآخرة جمع اللّٰه شمله وجعل غناه فى قلبه وأتته الدنيا وهى راغمة ومن كانت نيته الدنيا فرق اللّٰه عليه ضيعته وجعل فقره بين عينيه ولم يأته من الدنيا إلا ما كتب له وسألنا عن الصلٰوة الوسطى وهى الظهر.

''اللہ تعالیٰ اس شخص کو روشن کرے جو ہماری حدیث کو سنتا ہے اور اسے یاد کرتا ہے، یہاں تک کہ اسے دوسرے تک پہنچا دیتا ہے۔ کتنے ہی صاحب فقہ ہیں جو فقیہ نہیں ہیں اور کتنے ہی صاحب فقہ ہیں جن سے زیادہ بڑے بھی فقیہ ہیں۔ تین خصائل ایسے ہیں جن کے بارے میں مسلمان کا دل کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا: اللہ تعالیٰ کے لیے خالص عمل، مسلمانوں کے حکمرانوں کی خیر خواہی اور سیاسی اتحاد کے ساتھ وابستگی، کیونکہ (جو لوگ سیاسی اتحاد سے وابستہ رہتے ہیں) مسلمانوں کی دعا ان کے پیچھے سے ان کا احاطہ کرتی ہے۔ فرمایا: جس شخص کا مطمح نظر آخرت (کی فلاح) ہو، اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کے معاملات کو منظّم کردے گا اور اس کے دل کو اطمینان بخشے گا اور اس کو دنیوی فوائد سے بہرہ ور کرے گا، جبکہ وہ ان فوائد کو حقیر سمجھے۔ جس شخص کا مقصود دنیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کی دولت منتشر کر

دے گا اور اس کے چہرے پر پریشانی ڈال دے گا اور
دنیا میں سے اس کو اتنا ہی ملے گا جتنا اس کے لیے لکھ
دیا گیا ہے۔(راوی کہتے ہیں:) ہم نے آپ سے
صلٰوۃ وسطٰی کے بارے میں سوال کیا اور وہ ظہر کی نماز
ہے۔''

جیسا کہ بعض احادیث میں روایت کیا گیا ہے، یہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ احکام ایک ہی خطبہ میں ارشاد فرمائے ہوں۔ان احکام کی نوعیت مختلف ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کو مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا ہے۔

محمد وسیم اختر مفتی*

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کا یہ سیکشن مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

۔۔۔۔۔۔ ۱ ۔۔۔۔۔۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کے دادا کا نام غافل (حارث: ابن ہشام) اور پردادا کا حبیب (شمخ: ابن اسحاق) تھا۔ قبیلۂ بنوہذیل سے تعلق رکھتے تھے جو مضر کے پوتے ہذیل بن مدرکہ سے موسوم ہے۔ عام الفیل کے بارہ سال بعد پیدا ہوئے۔ بنوزہرہ کے حلیف تھے، ان کے والد نے زمانۂ جاہلیت میں عبداللہ بن حارث (یا عبدالحارث) بن زہرہ سے باہم عہد و پیمان کیا تھا۔ ان کی والدہ ام عبد (عبداللہ) بنت ود بھی بنوہذیل (یا بنوکنانہ کی شاخ قارہ) سے تھیں، انھیں قبول اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ ہند بنت عبدالحارث ان کی نانی تھیں۔ ابن مسعود کی کنیت ابوعبدالرحمان تھی۔ کہتے ہیں، اولاد ہونے سے پہلے ہی یہ کنیت مجھے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کی تھی۔ (مستدرک حاکم، رقم ۵۳۶۴)

حضرت عبداللہ بن مسعود ''السابقون الاولون'' میں سے تھے اور ان کی اکثریت کی طرح ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے، عقبہ بن ابومعیط کے مویشی چراتے تھے۔ اس وقت ایمان لائے جب سعید بن زید اور ان کی اہلیہ فاطمہ بنت خطاب نے اسلام قبول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دار ارقم میں منتقل نہ ہوئے تھے۔ قبول اسلام کے وقت حضرت عبداللہ کی عمر بیس برس تھی۔ وہ فخریہ طور پر اپنے آپ کو چھ میں سے چھٹا کہتے تھے۔ یہ بھی فرماتے، تب روے زمین پر ہمارے علاوہ کوئی مسلمان نہ تھا۔ (مستدرک حاکم، رقم ۵۳۶۸) کتب سیرت میں بیان کردہ ''السابقون الاولون'' کی فہرست میں ان کا نمبر بائیسواں ہے۔

* drwaseem_mufti@yahoo.com

ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا قصہ یوں ہے، ایک بار وہ بکریوں کا ریوڑ چرا رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر پاس سے گزرے۔ آپ نے فرمایا، بیٹا! دودھ ہے؟ حضرت عبداللہ نے کہا، ہاں، لیکن آپ کو نہیں پلا سکتا، کیونکہ میں امانت دار ہوں (اور آقا کے مال میں خیانت نہیں کر سکتا)۔ آپ نے پوچھا، کیا کوئی کم سن بھیڑ ہے (جسے دودھ نہ آتا ہو)؟ عبداللہ ایک نوعمر (ایک سال سے کم عمر والی) بھیڑ لے آئے۔ آپ نے اس کی ٹانگ کو قابو کیا، تھنوں پر دست مبارک پھیرا اور دعا مانگنے لگے۔ اس کے تھن پر ہو گئے اور کثیر مقدار میں دودھ اتر آیا۔ سیدنا ابوبکر برتن لے آئے، آپ نے دودھ دوہا، سیدنا ابوبکر کو پلایا اور خود پیا۔ آپ نے اس کے تھنوں پر پھر ہاتھ پھیرا اور فرمایا، سکڑ جا، سکڑ جا تو تھن پہلی حالت پر لوٹ آئے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا اور کہا، مجھے بھی قرآن کے پاک کلمات سکھا دیجیے۔ آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور علم کی دعا دی۔ آپ نے شفقت سے انھیں غلیم معلم (طفلک خواندہ) کہہ کر پکارا۔

ایک دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، میں اپنے چچاؤں اور قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ مکہ آیا۔ ہم نے عطر بیچنا اور مکہ سے کچھ سامان خریدنا تھا۔ لوگوں نے ہمیں عباس بن عبدالمطلب کے پاس بھیج دیا۔ وہ چاہ زمزم کے پاس بیٹھے تھے۔ ہم بھی وہیں بیٹھ گئے۔ اچانک کوہ صفا کی جانب سے ایک شخص نمودار ہوا جس کا رنگ سرخی مائل سفید تھا، اس کے گھنے، گھنگریالے بال آدھے کانوں تک لٹک رہے تھے، ناک اونچی اور بلند تھی، نتھنے باریک اور تنگ تھے، آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں، سامنے کے دانت خوب چمک رہے تھے، سینے پر باریک بال تھے، ہاتھ پاؤں مضبوط تھے، ڈاڑھی گھنی تھی، جسم پر دو سفید کپڑے ڈال رکھے تھے۔ گویا وہ چودھویں کی رات کا چاند ہے۔ اس کے داہنے طرف ایک خوب رو، نوعمر لڑکا (سیدنا علی) تھا جس کی مسیں ابھی نہ بھیگی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک خاتون (سیدہ خدیجہ) تھی جس نے اپنے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس شخص نے حجر اسود کا رخ کیا، اسے بوسہ دیا۔ پھر لڑکے اور خاتون نے بھی بوسہ لیا۔ پھر تینوں نے بیت اللہ کے سات چکر لگائے، رکن یمانی کے پاس آئے، ہاتھ بلند کیے اور اللہ اکبر کہا پھر کھڑے ہوئے، رکوع کیا، سجدہ ریز ہوئے پھر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے یہ عمل دیکھا تو عجیب محسوس ہوا، ایسا ہوتے مکہ میں کبھی دیکھا نہ تھا۔ چنانچہ عباس سے پوچھا، ابوالفضل! یہ دین تمھارے ہاں نیا آیا ہے یا ہمارے علم میں نہ تھا۔ انھوں نے جواب دیا، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ میرے بھتیجے حضرت محمد بن عبداللہ ہیں، لڑکا حضرت علی بن ابوطالب ہے اور خاتون حضرت خدیجہ بنت خویلد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اہلیہ ہیں۔ واللہ! ہمارے علم میں روے زمین پر ان تینوں کے علاوہ اس دین کا

کوئی پیرو نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود پہلے شخص تھے جنھوں نے مکہ میں قرآن پاک جہراً پڑھا۔ایک بار اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ان کو خیال آیا، واللہ! قریش نے بلند آواز میں قرآن مجید کبھی نہیں سنا، یہ مقدس کلام انھیں کون سنائے گا؟ حضرت عبداللہ نے کہا، میں سناؤں گا۔ ساتھیوں نے کہا، ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ تمھیں ماریں پیٹیں گے، اس لیے ہم چاہتے ہیں، یہ کام وہ شخص کرے جسے بچانے کے لیے اس کا کنبہ موجود ہو۔ ابن مسعود نے جواب دیا، مجھے اللہ بچائے گا۔ اگلا دن چڑھا، چاشت کے وقت قریش بیت اللہ میں اپنی مجلسیں جمائے ہوئے تھے کہ عبداللہ بن مسعود مقام ابراہیم کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور بآواز بلند سورۂ رحمان کی تلاوت کرنے لگے۔ قریش سوچ میں پڑ گئے کہ ابن ام عبد کیا کہہ رہے ہیں؟ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا کلام سنا رہے ہیں تو لپکے اور انھیں تھپڑ اور طمانچے مارنے لگے۔ ابن مسعود باز نہ آئے، مار کھاتے کھاتے انھوں نے سورہ کا ایک حصہ تلاوت کر ڈالا۔ جب وہ لال منہ کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹے تو انھوں نے کہا، ہمارا خدشہ سچ ثابت ہوا۔ حضرت عبداللہ نے کہا، اللہ کے دشمنوں سے میں اتنا بے خوف کبھی نہیں تھا جتنا اب ہوں۔ آپ لوگ چاہیں تو میں کل یہ مشق پھر دہرا سکتا ہوں۔ صحابہ نے کہا، اتنا ہی کافی ہے۔ سب سے پہلے زبانی قرآن پڑھنے والے بھی حضرت عبداللہ بن مسعود ہی تھے۔ حضرت عبداللہ کے بھائی حضرت عتبہ بن مسعود بھی نعمت ایمان سے سرفراز ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کو حبشہ و مدینہ دونوں شہروں کی طرف ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں مسجد اقصیٰ و بیت اللہ دونوں قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ پہلی ہجرت کے دوسرے مرحلہ میں شامل ہوئے اور ہجرت مدینہ سے پہلے مکہ لوٹ آئے۔ خود بیان کرتے ہیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے پاس بھیجا۔ ہم اسی (یا تراسی) افراد تھے، حضرت جعفر طیار اور حضرت عثمان بن مظعون ہمارے ساتھ تھے۔ قریش کے قبول اسلام کی افواہ حبشہ میں موجود مسلمانوں تک پہنچی تو ان میں سے کچھ کشتی پر سوار ہو کر مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب یہ خبر غلط ثابت ہوئی تو ان میں سے کچھ حبشہ لوٹ گئے، تاہم سیدنا عثمان بن عفان، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت عبدالرحمان بن عوف اور حضرت عبداللہ بن مسعود ان تینتیس اصحاب میں شامل تھے جو واپس نہ گئے اور مکہ ہی میں مقیم ہو گئے۔ ایک بار ابن مسعود حبشہ میں گرفتار ہو گئے تو دو دینار دے کر چھوٹے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے سے پہلے میں نے مکہ کے مقام منیٰ پر چاند کو دو ٹکڑے ہوئے دیکھا ہے، ایک ٹکڑا جبل ابوقبیس پر اور دوسرا سویدا کے مقام پر تھا۔ قریش نے کہا، یہ ابن ابی کبشہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا سحر ہے تو انھی میں سے کچھ نے اعتراض کیا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام انسانوں پر جادو تو نہیں کر سکتے۔ (بخاری، رقم ۳۶۳۶، مسلم، رقم ۷۱۷۴) ابن مسعود فرماتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم مکہ میں سورۂ نجم تلاوت فرمائی۔ آیت سجدہ پر آپ سجدہ ریز ہوئے تو تمام مشرکین بھی آپ کے ساتھ سجدے میں گر گئے۔ ایک بڈھے ولید بن مغیرہ نے مٹی کی مٹھی بھر کر پیشانی کو لگا لی اور کہا، مجھے اتنا ہی کافی ہے، بعد میں وہ کافر ہی مرا۔ (بخاری، رقم ۴۸۶۳)

حضرت علقمہ کہتے ہیں، میں نے ابن مسعود سے پوچھا، جس رات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنوں سے ملاقات ہوئی، کیا آپ میں سے کوئی ساتھ تھا؟ انھوں نے جواب دیا، نہیں۔ مکہ میں ایک رات ہم نے آپ کو موجود نہ پایا تو بہت پریشان ہوئے۔ آپ کو وادیوں اور گھاٹیوں میں ڈھونڈا۔ آپ نہ ملے تو رات وسوسوں اور اندیشوں میں کٹ گئی۔ سحر کے وقت ہم نے آپ کو حرا کی جانب سے آتے دیکھا۔ آپ نے بتایا، مجھے ایک جن بلانے آیا تھا، میں اس کے ساتھ گیا اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو قرآن سنایا۔ (مسلم، رقم ۹۳۸) ایک شاذ روایت میں ہے، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا، کون آج رات میرے ساتھ جا کر جنوں سے ملاقات کرنا چاہتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں، میرے سوا کوئی نہ گیا۔ ہم بالائی مکہ کے مقام حجون پر پہنچے تو آپ نے اپنے پاؤں سے ایک دائرہ کھینچا اور مجھ سے فرمایا، اس کے اندر بیٹھ جاؤ۔ آپ نے کھڑے ہو کر قرآن کی تلاوت شروع کی تھی کہ کئی ہیولے میرے اور آپ کے بیچ حائل ہو گئے۔ میں آپ کی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ کافی وقت گزر گیا تو وہ ہیولے چھٹنے لگے اور بادلوں کی طرح ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر منتشر ہو گئے۔ فجر کے وقت آپ فارغ ہوئے اور رفع حاجت کر کے واپس آئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے ایک بار کچھ ہندوستانی جاٹوں کو گزرتے دیکھا تو کہا، جنوں والی رات میں نے جو جن دیکھے ان سے ملتے جلتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق کفار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے بارے میں سوال (یسئلو نك عن الروح: سورۂ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۵) ہجرت سے پہلے مکہ میں کیا، تاہم حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں، یہ واقعہ مدینہ میں پیش آیا۔ بتاتے ہیں، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے کھنڈرات میں جا رہا تھا۔ آپ کچھ یہودیوں کے پاس سے گزرے تو انھوں نے سوال کیا، ابوالقاسم! روح کیا شے ہے؟ آپ کچھ دیر کے لیے خاموش

ہوگئے تو مجھے پتا چل گیا کہ آپ پر وحی آ رہی ہے۔ ایک توقف کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی، 'الروح من امر ربی'، ''روح میرے رب کے حکم سے ہے''۔ (بخاری، رقم ۱۲۵، مسلم، رقم ۷۱۶۱) کئی صحابہ کی طرح ابن مسعود رویت باری تعالیٰ کے قائل تھے، جبکہ سیدہ عائشہ اسے خارج از امکان سمجھتی تھیں، البتہ دونوں مانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ رکھا ہے، ان کے چھ سو پر ہیں۔ (بخاری، رقم ۳۲۳۲)

سب سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت عمرو بن ام مکتوم مدینہ پہنچے پھر حضرت عمار بن یاسر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور سیدنا بلال نے ہجرت کی۔ سیدنا عمر بیس افراد کے قافلہ کے ساتھ مدینہ آئے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر کی آمد ہوئی۔ ابن مسعود حضرت معاذ بن جبل (یا سعد بن خیثمہ) کے مہمان ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں حضرت زبیر بن عوام (یا انس بن مالک) کو حضرت عبد اللہ بن مسعود کا بھائی قرار دیا تھا۔ مدینہ تشریف آوری کے بعد آپ نے ابن مسعود اور حضرت معاذ بن جبل (یا سعد بن معاذ) میں مواخات قائم فرمائی۔ آپ نے مہاجرین میں گھروں کی تقسیم کی تو سیدنا عبد اللہ بن مسعود، عتبہ بن مسعود اور بنوزہرہ کو مسجد نبوی کی پشت پر جگہ ملی۔ ابن مسعود کے حلفا بنوزہرہ نے درخواست کی کہ ابن ام عبد کو ہم سے دور رکھا جائے۔ آپ نے غصہ سے فرمایا، کیا اللہ نے مجھے اسی لیے مبعوث کیا ہے؟ اللہ اس قوم کو تقدس عطا نہیں کرتا جس میں کم زور کو اس کا حق نہیں دیا جاتا۔ امام باقر کہتے ہیں، مدینہ میں مہاجرین کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جو ایک تہائی یا ایک چوتھائی حصۂ فصل پر (انصار کی زمینیں) کاشت نہ کرتا ہو۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود بھی بٹائی پر کاشت کرتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کو اپنے ساتھ ایسا وابستہ کر لیا کہ وہ آپ کے حجرہ میں داخل ہو جاتے، جوتا پہناتے، عصا تھامتے، آپ کے ساتھ یا آگے چلتے، آپ مجلس میں فروکش ہوتے تو وہ جوتا اتار کر خود پکڑ لیتے اور عصا آپ کو دے دیتے۔ آپ غسل فرماتے تو ستر کا اہتمام کرتے، سو جاتے تو آپ کو جگاتے۔ آپ سفر پر جاتے تو آپ کے بستر، مسواک اور طہارت کے پانی کا خیال رکھتے۔ اسی لیے انھیں صاحب النعلین والسواک (جوتے اور مسواک کی ذمہ داری اٹھانے والا) کہا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ خود بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، تجھے میرے پاس آنے کی اجازت ہے۔ پردہ اٹھا لیا جائے اور تو میری سرگوشیاں سنے۔ یہ اجازت تب تک ہے جب تک میں تمھیں منع نہیں کرتا۔ (مسلم، رقم ۵۷۱۷) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر قریب ہونے کی وجہ سے صاحب السواد (سرگوشیاں سننے والا، راز دان رسالت) ان کا لقب ہو گیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری بتاتے ہیں، میں اور میرا بھائی یمن سے مدینہ آئے تو سمجھے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے فرد ہیں، کیونکہ وہ اور ان کی والدہ (بلا تکلف) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے جاتے تھے۔ (بخاری، رقم

۳۷۶۳، مسلم، رقم ۶۴۰۸، ترمذی، رقم ۳۸۰۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود بدر، احد، خندق، اور تمام غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بشانہ شریک رہے۔

جنگ بدر سے پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ سے رائے لی۔ حضرت مقداد بن اسود نے جوشیلی تقریر کرتے ہوئے کہا، یا رسول اللہ! ہم آپ کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں، ''میں نے اس موقع پر مقداد کا وہ رنگ دیکھا کہ اب یہ حسرت مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوگئی ہے، کاش یہ سب ان کے بجاے میں نے کہا ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ مقداد کی تقریر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔'' (بخاری، رقم ۳۹۵۲، ۴۶۰۹) جنگ کا بازار گرم ہوا تو عمرو بن جموح کے صاحب زادے معاذ نے تلوار کا وار کر کے ابوجہل کی آدھی ٹانگ اڑا دی، ان کے دوسرے بیٹے معوذ نے اسے شدید زخمی کر دیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر حضرت عبداللہ بن مسعود ابوجہل کو زخمیوں میں تلاش کرنے آئے (بخاری، رقم ۴۰۲۰) اور اس کا سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ابوجہل نے مرتے وقت کہا، کاش مجھے قتل کرنے والا چرواہا یا کاشت کار نہ ہوتا۔ (مسلم، رقم ۴۶۸۵) دوسری روایت میں خود ابن مسعود کی زبانی یہ واقعہ ذرا مختلف طرح بیان ہوا ہے، بدر کے دن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا، یا رسول اللہ! میں نے ابوجہل کو جہنم رسید کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا، اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! تم نے اسے قتل کر دیا ہے؟ میں نے کہا، ہاں۔ آپ بے حد خوش ہوئے اور فرمایا، چلو مجھے دکھاؤ۔ میں آپ کو لے کر چلا اور ابوجہل کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ فرمایا، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس امت کے فرعون کو رسوا کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود مزید تفصیل بتاتے ہیں، ابوجہل زخمی تھا، اس کے سر پر خود اور ہاتھ میں عمدہ تلوار تھی۔ میں نے اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ کر کہا، دشمن خدا! اللہ نے تمھیں رسوا نہیں کر دیا؟ پھر اپنی پرانی تلوار سے اس پر وار کیا، اس نے کام نہ کیا تو اسی کی تلوار چھین کر اس سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تلوار مجھے غنیمت میں عطا کر دی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود جنگ احد کے بارے میں نازل ہونے والی قرآن مجید کی اس آیت 'اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَہُمُ الۡقَرۡحُ'، ''جنھوں نے گھاؤ کھانے کے بعد اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا''۔ (سورۂ آل عمران ۳: ۱۷۲) کی تفسیر میں بتاتے ہیں، میں ان اٹھارہ جوانوں میں شامل تھا جو اس موقع پر موجود تھے۔ البتہ یہ روایت درست نہیں کہ جنگ احد میں جب ابتدائی ہزیمت کے بعد جیش اسلامی منتشر ہو گیا تو ابن مسعود ان چار جاں نثار صحابہ میں سے ایک تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود صلح حدیبیہ میں شامل ہوئے۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے

اندر رکھے ہوئے بتوں کو پاش پاش کیا تو بھی وہ آپ کے ساتھ تھے۔

حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں، جنگ حنین کے دن جب سب مسلمان بکھر گئے تھے، میں ان اسی (۸۰) مسلمانوں میں شامل تھا جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ چھوڑا۔ انھی پر اللہ نے اپنی سکینت اتاری۔ آپ خچر کو آگے بڑھاتے چلے گئے۔ وہ ایک طرف کو جھکا تو آپ زین سے گرنے لگے۔ آپ نے فوراً اسے اپنی طرف کھینچا اور مجھے ایک مٹھی مٹی دینے کا حکم دیا پھر مٹی پکڑ کر کافروں کی آنکھوں میں جھونک دی اور پکارے، کہاں ہیں مہاجرین و انصار؟ جواب ملا، ہم یہاں ہیں۔ سب تلواریں سونت کر بجلی کی تیزی سے پلٹے تو مشرکوں نے پیٹھ دکھا دی۔ فتح حاصل کرنے کے بعد مال غنیمت کی تقسیم میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے کچھ سرداروں (مؤلفۃ القلوب) کو فوقیت دی۔ اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو سو سو اونٹ عطا کیے۔ ایک شخص نے کہا، اس تقسیم میں (معاذ اللہ) انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ ابن مسعود نے یہ بات آپ کو بتا دی۔ غصے اور دکھ سے آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا، فرمایا، اللہ اور رسول انصاف نہ کریں گے تو کون انصاف کرے گا؟ اللہ موسیٰ علیہ السلام پر رحم کرے، انھیں اس سے زیادہ ایذا پہنچائی گئی تو انھوں نے صبر کیا۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں، مجھے یہ دیکھ کر اتنا رنج ہوا کہ فیصلہ کیا، آیندہ ہرگز ایسی بات آپ تک نہ پہنچاؤں گا۔ (مسلم، رقم ۲۴۱۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ تبوک کے لیے مدینہ سے نکلے تو آپ کو بار بار اطلاع ملتی کہ فلاں شخص پیچھے رہ گیا ہے، فلاں واپس ہو گیا ہے۔ آپ فرماتے، جانے دو، اگر نیکی کی رمق بھی ہوئی تو اللہ اسے واپس لے آئے گا۔ سیدنا ابوذر غفاری کا اونٹ چلنے پر آمادہ نہ ہوا تو وہ بوریا بستر کمر پر لاد کر پیدل چل پڑے۔ صحابہ نے انھیں دور سے آتے دیکھا تو کہا، ایک شخص پیدل چلا آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا، ابوذر ہی ہو گا۔ اللہ اس پر رحم فرمائے، اکیلا چلے گا، اکیلا فوت ہو گا اور اکیلا ہی اٹھایا جائے گا۔ عہد عثمانی میں ربذہ کے مقام پر سیدنا ابوذر کی وفات ہوئی تو وصیت کی، کفن پہنا کر میری میت کو راستے میں رکھ دینا۔ ابن مسعود کوفہ سے آ رہے تھے۔ انھوں نے سر راہ میت دیکھی تو اترے، معلوم ہوا کہ سیدنا ابوذر کا جنازہ ہے تو رو پڑے اور کہا، رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا، ابوذر تنہا فوت ہو گا اور روز قیامت تنہا ہی اٹھایا جائے گا۔ پھر نماز جنازہ پڑھائی اور تدفین میں حصہ لیا۔

تبوک کے مقام پر عبداللہ ذوالبجادین نے وفات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تدفین کے لیے خود لحد میں اترے۔ میت رکھ کر آپ نے دعا فرمائی، اللہ! میں ذوالبجادین سے راضی ہوں، تو بھی راضی ہو جا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے تمنا کی، کاش صاحب قبر میں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے خود حضرت عبداللہ بن مسعود کے اخلاص کی شہادت دی ہے۔ مشرکین قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے مطالبہ کیا کہ عمار، صہیب ، بلال، خباب اور عبداللہ بن مسعود کی طرح کے غریب مسلمانوں کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔(مسلم، رقم ۶۳۲۰) اسلام کو غلبہ حاصل ہوا اور لوگ جوق در جوق دین میں داخل ہونے لگے تو یہ تقاضا عرب کے نومسلم سرداروں نے بھی کیا۔ بنوتمیم کے سردار اقرع بن حابس اور بنوفزارہ کے عیینہ بن حصن مدینہ آئے تو دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انھی چاروں مخلص مسلمانوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں، چند اور غربا بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔(ابن ماجہ، رقم ۴۱۲۸) ان کو حقارت سے دیکھنے کے بعد وہ آپ کو علیحدہ لے گئے اور فرمایش کی کہ ہمارے مرتبے کے مطابق ہمارے لیے الگ نشست مقرر کی جائے۔ عرب کے مختلف اطراف سے آنے والے وفود نے اگر ہمیں ان کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا تو عار کی بات ہوگی۔ آپ نے اس رغبت میں کہ یہ سردار اسلام پر ثابت قدم ہو جائیں، ایسا کرنے کا ارادہ کیا، لیکن یہ اتنا اہم معاملہ تھا کہ اللہ کی طرف سے فوراً وحی نازل ہوئی:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَامِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. (الانعام ۶:۵۲)

”اے نبی! ان اہل ایمان کو نہ دھتکاریے جو اپنے رب کو اس کی خوش نودی چاہنے کے لیے صبح و شام پکارتے ہیں۔ ان کے حساب میں سے آپ پر کوئی بار نہیں، نہ آپ کے حساب میں سے ان کے ذمہ کچھ آئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ آپ ان کو دھتکاریں اور ظالموں میں شامل ہو جائیں۔“

سورۂ کہف (۱۸) آیت ۲۸ میں یہی مضمون دوسرے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جھوٹے مدعیان نبوت اور ارتداد کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر نے مدینہ کے کم زور مقامات کی نگرانی کے لیے فوجی دستے مقرر کیے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ان میں شامل تھے۔ اہل مدینہ کو عدی بن حاتم طائی کے دستے کی کامیابی کی خبر انھوں نے دی۔ ابن مسعود نے جنگ یرموک اور شام کی فتوحات میں بھی حصہ لیا۔ جنگ یرموک میں مال غنیمت کی تقسیم ان کے ذمہ تھی۔ ایک شخص نے عبداللہ بن مسعود کو بتایا کہ بنوحنیفہ کی ایک مسجد میں من گھڑت سورتوں کی تلاوت کی جا رہی ہے۔ وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک سوستر مرتدوں کا ایک گروہ ہے جس کی لیڈری عبداللہ بن نواحہ کر رہا ہے۔ انھوں نے اسے قتل کرا دیا۔ یہ وہی شخص تھا جو ابن اثال نامی مرتد کے ساتھ مسیلمہ کذاب کا ایلچی بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا، اگر میں ایلچیوں کو قتل کرانے والا ہوتا تو تم دونوں کو ضرور مروا دیتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں، ابن اثال تو اپنا انجام پا چکا ہے، ابن نواحہ کی پھانس میرے دل میں تھی، اللہ نے وہ بھی نکال دی۔ اس کے ساتھیوں کے

بارے میں انھوں نے دیگر صحابہ سے مشورہ لیا۔عدی بن حاتم نے قتل کرنے کو کہا، تاہم جریر اور اشعث بن قیس نے مشورہ دیا، ان سے توبہ کرائیں اور (آیندہ مرتد نہ ہونے کی) ضمانت طلب کریں۔ چنانچہ انھوں نے توبہ کی اور ان کے اہل قبیلہ نے ضمانت دی۔(بخاری، رقم ۲۲۹۰)

سیدنا عمر فاروق نے زمام خلافت سنبھالی تو حضرت عبداللہ بن مسعود حمص میں مقیم تھے۔وہ ۱۵ھ میں حمص کی پہلی جنگ میں شریک ہوئے۔رومیوں پر محاصرہ تنگ ہوا اور وہ صلح پر مجبور ہوئے تو کمانڈر ابوعبیدہ بن جراح نے فتح کی بشارت دینے اور مال غنیمت خمس پہنچانے کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود کو مدینہ روانہ کیا۔۲۱ھ میں سیدنا عمر نے انھیں تبلیغ اسلام کے لیے کوفہ روانہ کیا اور بیت المال کی نگرانی بھی سونپی۔تب حضرت عمار بن یاسر ان کے مقررہ گورنر تھے۔ دونوں کو روانہ کرنے کے بعد سیدنا عمر نے خط لکھا، یہ صاحب شرف، بدری صحابہ ہیں، ان کی پیروی کرو اور دھیان سے ان کی بات سنو۔میں نے تمھارے لیے عبداللہ کو اپنی ذات سے بہتر سمجھا ہے۔کوفہ پہنچ کر انھوں نے مسجد کے پاس گھر بنوایا۔قرآن وسنت کا عالم ہونے کی وجہ سے لوگ ان سے مسائل پوچھتے۔ایک بار افواہ پھیلی کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے ساتھی کسی سفر میں پیاس کی شدت سے جاں بحق ہو گئے ہیں۔سیدنا عمر نے کہا، مجھے یقین ہے اللہ نے ان کے لیے چشمہ جاری کر دیا ہوگا۔حضرت عبداللہ بن مسعود نے بیت المال کی چاندی پگھلوائی۔اس کے رنگ بدلنے لگے تو انھوں نے بیت المال کے باہر موجود لوگوں کو بلا کر کہا، یہ ابلتی ہوئی چاندی قرآن مجید میں بیان کردہ مُہل (ان شجرة الزقوم طعام الاثیم کالمهل) سے ادنیٰ مشابہت رکھتی ہے۔ایک بار گورنر کوفہ ولید بن عقبہ نے فجر کی چار رکعتیں پڑھا ڈالیں پھر منہ موڑ کر مقتدیوں سے پوچھا، کیا میں نے کچھ بڑھا دیا ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود بھی نمازیوں میں شامل تھے۔کہا، تمھاری معیت میں آج تک ہم زیادتی ہی کا شکار رہے ہیں۔

[باقی]

الطاف احمد اعظمی*

صلوٰۃ (نماز)

[یہ مصنف کی طبع شدہ کتاب ''اسلامی عبادات: تحقیقی مطالعہ'' کا ایک جز ہے۔ قارئین ''اشراق''
کے افادے کے لیے اس کتاب کے جملہ مباحث بالاقساط شائع کیے جا رہے ہیں۔]

—— ۱ ——

اسلام کی طرح یہودیت اور عیسائیت میں بھی نماز (Prayer) فرض ہے، لیکن اجزاے ترکیبی، اوقات اور طریقۂ ادائیگی کے لحاظ سے ان میں نمایاں فرق ہے۔ صلوٰۃ (نماز) پر گفتگو سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اسلام کی نماز کے امتیازی اوصاف واضح ہوں۔

یہودیوں کی نماز

یہودی مذہب میں نماز کی حقیقت خدا کا شکر بجالانا اور گناہوں کی معافی چاہنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا نے زندگی دی اور تورات عطا کی اس لیے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی تعریف کی جائے اور اس کا شکر بجالایا جائے۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"Confession and repentance of sin on the one hand, and thanks giving on the other, are perhaps the two most importand parts of worship."

''یہودی عبادت دو اہم اجزاء پر مشتمل ہے، ایک اعتراف گناہ اور توبہ و استغفار، اور دوسرا اظہار تشکر۔''
(دی انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن (نیویارک/لندن ۱۹۸۷) ۱۵/۴۴۶-۴۴۷)

* آر زیڈ ۱۹۰ بی، فلیٹ نمبر ۴۰۲، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی-۱۹۔

یہودی مذہب میں انفرادی اور اجتماعی دونوں نمازیں ہیں۔ انفرادی نماز کسی وقت ادا کی جا سکتی ہے بالخصوص کسی اہم واقعہ کے ظہور پذیر یا بیماری سے شفایابی یا سبت (Sabbath) کے موقع پر روشنی کرتے وقت[1]۔

اجتماعی نماز دن میں تین بار ہوتی ہے اور یہ عبادت خانوں (Synagogues) میں ادا کی جاتی ہے۔ تورات کا عالم (ربّی) ان کو نماز پڑھاتا ہے۔ ہفتہ یعنی سنیچر کے دن زیادہ بڑا اجتماع ہوتا ہے جس میں تورات کو اونچی آواز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس میں تمام اسرائیلی مرد اور عورت شرکت کرتے ہیں۔

یہودی اپنی نمازوں میں قدرے ترنم کے ساتھ تورات کی آیات تلاوت کرتے ہیں۔ دوران نماز وہ کبھی مراقبے میں چلے جاتے ہیں، کبھی زور سے خدا کو پکارتے ہیں، کبھی کھڑے رہتے ہیں، کبھی کھڑے کھڑے جھومتے ہیں، کبھی جھکتے اور سجدہ کرتے ہیں۔ نماز کے وقت ان کا رخ یروشلم کی طرف ہوتا ہے۔

عیسائیوں کی نماز

عیسائیوں کی نماز میں واقعۂ صلیب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دی گئی اور اتوار کو، عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق، وہ جی اٹھے۔ چنانچہ پہلی صدی عیسوی تک عیسائی بطور تشکر روٹی اور شراب نمازوں میں پیش کرتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں، ان کے عقیدہ کے مطابق، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسم اور خون کی علامت کی حیثیت رکھتی تھیں[2]۔

لیکن دوسری صدی عیسوی میں روٹی اور شراب[3] کی رسم کی ادائیگی سے پہلے انجیل کی تلاوت کی جانے لگی۔ تلاوت کے بعد امام بتاتا کہ ابھی جو تلاوت کی گئی ہے اس کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے بعد وہ وعظ کہتا اور لوگوں کو اچھے اعمال کی تلقین کرتا، بعد ازاں عبادت میں شریک لوگ ایک دوسرے کے لیے دعاے خیر کرتے۔ اس کے بعد مقدس عشاء ربانی (The Eucharist) یعنی روٹی اور شراب کو میز پر رکھا جاتا۔ ان رسوم کی ادائیگی کے بعد نماز ادا کی جاتی تھی[4]۔

۱؎ دی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن ۱۵/۴۴۵۔

۲؎ دی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن ۱۵/۴۴۹۔

۳؎ نویں صدی عیسوی سے تمام مغربی چرچوں میں روٹی اور شراب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں تبدیل کر دیا گیا، یعنی یہ میرا جسم اور یہ میرا خون ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن ۱۵/۴۴۹)

۴؎ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن ۱۱/۴۵۰۔

جس طرح عیسائیوں میں طریقۂ نماز شروع سے غیر متعین رہا اور وہ برابر بدلتا رہا اسی طرح نماز کے اوقات بھی متعین نہیں تھے۔ شروع میں تین وقت کی نمازیں تھیں لیکن ان کا وقت واضح طور پر مقرر نہ تھا۔ ایک روایت ہے کہ صبح و شام اور آدھی رات کے علاوہ دن کے تیسرے، چھٹے اور نویں گھنٹے میں نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ انفرادی نمازیں تھیں۔ شروع میں صبح کی نماز اجتماعی تھی۔ کبھی شام کی نماز بھی اجتماعی طور پر ادا کی جاتی تھی۔ لیکن چوتھی صدی عیسوی میں صبح و شام کی نمازیں باقاعدہ اجتماعی طور پر ادا کی جانے لگیں۔ سولہویں صدی میں اس میں مزید اصلاح ہوئی اور انفرادی نمازوں کو بھی دن کے دو اوقات میں خاص کر دیا گیا یعنی صبح و شام۔ بیسویں صدی میں یہ اصلاح کی گئی کہ صبح و شام کی اجتماعی نماز کو باقی رکھا گیا، لیکن درمیان میں نفل نمازیں بھی رکھی گئیں جن کی ادائیگی نمازی کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس کے علاوہ ہفتہ میں ایک بار اتوار کے روز اجتماعی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس میں زبور کی تلاوت ضروری ہے[۵]۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے اس مختصر ذکر کے بعد اب ہم صلوٰۃ یعنی اسلامی نماز کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں، لیکن اس سے پہلے لفظ صلوٰۃ کے لغوی اور قرآنی معانی پر ایک اجمالی نظر ڈال لینا ضروری ہے تاکہ اس کے مغز و جوہر تک رسائی ہو سکے۔

صلوٰۃ کے لغوی معنی

لفظ صلوٰۃ باعتبار مادہ نہایت قدیم ہے۔ کلدانی اور عبرانی دونوں میں گو کہ اس کا املا مختلف ہے، لیکن تلفظ ایک ہے یعنی صلا۔ اس مادے میں جلانے کا مفہوم غالب ہے۔ چنانچہ عبرانی میں اس کے معنی جلانے اور کباب کرنے کے ہیں[۶]۔ عربی میں بھی اس کے یہی معنی ہیں۔ اس کے علاوہ آگ میں لکڑی تپا کر اس کو سیدھا کرنے کا مفہوم بھی اس میں داخل ہے۔

قدیم زمانے میں دعا اور عبادت کے وقت آگ یا بخور جلاتے تھے۔ اسی مناسبت سے آگے چل کر یہ عمل صلوٰۃ کہلایا۔ کلدانی، عبرانی اور سریانی، تینوں زبانوں میں یہ لفظ دعا اور عبادت کے لیے مستعمل رہا ہے۔ عربی میں بھی دعا اور عبادت کے لیے اس کا استعمال قدیم ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً ''کعبہ کے پاس مشرکین کی نماز محض سیٹی اور تالیاں

۵؎ انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن ۱۱/۴۵۱۔

۶؎ یہودی مذہب میں مذبح پر قربانی کے گوشت کو جلانا ایک بڑی عبادت سمجھا جاتا ہے۔

وَّ تَصۡدِيَةً. (سورۂ انفال ۸: ۳۵)　　　　بجانا تھا۔‘‘

امام راغب صلٰوۃ کے لغوی معنی کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

’’بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلٰوۃ کے معنی دعا کرنے، برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں۔ بولا جاتا ہے: ’صليت عليه ‘یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی اور بزرگی سے یاد کیا۔ آں حضرت کا ارشاد ہے: ’اذا دعی احدکم الی طعام فليجب وان كان صائما فليصل‘‘’جب تم میں سے کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو دعوت قبول کرنا چاہیے اور اگر روزہ دار ہو تو دعا کرنا چاہیے (یعنی دعوت کرنے والے کے حق میں دعا کرے)‘‘۔‘‘

(مفردات راغب ۲۸۵)

اس سلسلے میں مولانا فراہی کی تحقیق قابل ذکر ہے:

’’صلٰوۃ (نماز) کا اصل مفہوم ’اقبال الی الشئ‘ ہے، یعنی کسی شے کی طرف بڑھنا اور لپکنا۔ یہی مفہوم رکوع، تعظیم اور دعا کا بھی ہے۔ یہ کلمہ نماز و عبادت کے لیے قدیم زمانہ سے مستعمل ہے۔ کلدانی میں دعا اور تضرع کے لیے اور عبرانی میں نماز اور رکوع کے لیے آیا ہے۔‘‘ (رسالہ فی اصلاح الناس ۸)

انھوں نے مزید لکھا ہے:

’’نماز نہ صرف ذریعۂ تقرب بلکہ عین تقرب ہے... میرے خیال میں عربی میں صلٰوۃ کا اصل مفہوم بھی قربت قریبہ ہی کا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف بڑھنا اور اس میں داخل ہو جانا۔ اسی لیے گھوڑ دوڑ کے اس گھوڑے کو جو اگلے گھوڑے کے بعد ہو مصلی کہتے ہیں۔ جو شخص آگ کے پاس نہایت قریب ہو کر تاپ رہا ہو اس کو صالی کہتے ہیں۔ یہی لفظ اس شخص کے لیے استعمال کیا جائے گا جو آگ میں گھس جائے۔‘‘

(رسالہ فی اصلاح الناس ۳۹-۴۰)

اس لغوی تحقیق کے بعد یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآن میں یہ لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے تاکہ صلٰوۃ کا قطعی مفہوم متعین کیا جا سکے۔ قرآن میں یہ لفظ دعا کے معنی میں ایک سے زیادہ مقامات پر استعمال ہوا ہے، اور دعا توجہ الی اللہ ہی کی ایک صورت ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ. (سورۂ توبہ ۹: ۹۹)

’’اور ان بدویوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو قرب الٰہی اور رسول کی دعا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔‘‘

سورۂ توبہ ہی میں دوسری جگہ ہے:

وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ. (۱۰۳)

''اور ان کے لیے دعا کرو، بے شک تمھاری دعا ان کے لیے باعث تسکین ہے، اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

سورۂ نور میں بھی یہ لفظ دعا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّيۡرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِيۡحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ. (۲۴: ۴۱)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور پرندے بھی پروں کو پھیلائے ہوئے، اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی دعا اور تسبیح معلوم ہے۔ اور اللہ پوری طرح باخبر ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں۔''

اس آیت میں تسبیح کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور صلٰوۃ پر عطف ہے، جس سے مقصود اس کی تشریح ہے۔ تسبیح کے معنی بلند آواز سے کسی کو پکارنے اور اس کی بڑائی بیان کرنے کے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

قبح اللّٰهُ وجوه تغلب كلما
سبح الحجيج و كبّروا اهلا

''خدا قبیلہ بنی تغلب والوں کے منہ کو ہر ایسے موقع پر کالا کرے جب کہ حاجی لوگ دعا کے ساتھ اپنی آوازیں بلند کریں اور تکبیر و تہلیل کریں۔''

صلٰوۃ بمعنی دعا کی مزید تشریح آیۂ مذکورہ بالا میں ''صلوۃ الطیر'' کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جو ایک مشاہداتی حقیقت ہے۔ صبح و شام کے مقررہ اوقات میں چڑیوں کی زمزمہ سنجی دراصل خدا کی تسبیح کی ایک صوتی شکل ہے۔ ''صلا'' ہی سے تصلیہ ہے یعنی دعا کرنا۔ عرب کا ایک شاعر ابوقیس بن اسلت جاہلی یثربی کہتا ہے:

قوموا فصلو ربكم و تعوذوا
باركان هذا البيت بين الاخاشب

''کھڑے ہو کر اپنے رب سے دعا کرو اور اس گھر کے ستونوں کی پناہ لو جو پہاڑوں کے درمیان ہے۔''

معلوم ہوا کہ صلٰوۃ کے اصلی معنی دعا کے ہیں۔ عبادت خانہ کو بھی صلٰوۃ کہا جاتا ہے۔ عبرانی میں اس کو صلوتا کہتے ہیں[۷]۔ قرآن مجید میں ہے:

۷؎ الاتقان فی علوم القرآن، ۱/۱۴۰۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا. (سورۂ حج ۲۲: ۴۰)

''اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں، جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، ڈھا دیے گئے ہوتے۔''

وہ صلوٰۃ جو ایک مخصوص عبادت ہے یعنی نماز اس کی اصل بھی دعا ہے۔ جس طرح کسی شے کو اس کے اہم جز سے موسوم کرتے ہیں اسی طرح یہ عبادت بھی صلوٰۃ سے موسوم ہوئی کہ اس کا بڑا حصہ خدا کی حمد و تسبیح اور اس کی مناجات پر مشتمل ہے۔

لیکن شرع میں جب صلوٰۃ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے اصطلاحی معنی مراد ہوتے ہیں، یعنی ایک مخصوص بدنی عبادت (نماز) جو شب و روز کے پانچ معینہ اوقات میں ادا کی جاتی ہے۔

اقامت صلوٰۃ کا مفہوم

قرآن میں 'اقیموا الصلوٰۃ' کا جملہ بکثرت مقامات پر آیا ہے۔ اس لیے صلوٰۃ کے بعد اقامت کے معنی و مفہوم سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ اقامت کے لغوی معنی کسی چیز کو اس طرح کھڑا کرنے کے ہیں کہ اس میں کوئی کجی نہ ہو۔ اگر کسی لکڑی کو بالکل سیدھا کھڑا کر دیا جائے تو کہا جائے گا: 'اقام العود'۔ اسی معنی میں قرآن مجید میں ہے:

فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ. (سورۂ کہف ۱۸: ۷۷)

''وہاں ان دونوں نے ایک دیوار کو اس حال میں پایا کہ وہ بالکل گرا چاہتی تھی پس اس نے وہ دیوار سیدھی یعنی کھڑی کر دی۔''

حدیث میں آیا ہے:

لن یقبضه حتی یقیم به الملة العوجاء. (بخاری، کتاب البیوع)

''اللہ ان (آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کی روح اس وقت تک قبض نہیں کرے گا جب تک کہ ملت عوجاء (ملت عرب) کو سیدھا نہ کر دے[۸]۔''

اقامت کے دوسرے معنی کسی کام کو اس طرح انجام دینے کے ہیں کہ اس کا حق ادا ہو جائے۔ 'اقامة الشئ: توفية حقه'[۹] اس سلسلے میں قرآن کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔ فرمایا گیا:

۸۔ ملت عرب کی کجی ان کا شرک تھا اور ان کو سیدھا کرنے سے مراد توحید پر ان کو قائم کرنا تھا۔

قُلُ یٰٓاَھُلَ الُکِتٰبِ لَسُتُمُ عَلٰی شَیُءٍ حَتّٰی تُقِیُمُوا التَّوُرٰۃَ وَالُاِنُجِیُلَ وَمَآ اُنُزِلَ اِلَیُکُم مِّنُ رَّبِّکُمُ. (سورۂ مائدہ ۵:۶۸)

''کہہ دو، اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم تورات، انجیل اور اس چیز کو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس بھیجی گئی ہے، قائم نہ کرو۔''

اس آیت میں تورات، انجیل اور اس چیز، یعنی قرآن کی اقامت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کتابوں کی ٹھیک ٹھیک تلاوت کی جائے، ان کے احکام و ہدایات پر کسی کمی و بیشی کے بغیر عمل کیا جائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَّاَشُھِدُوُا ذَوَیُ عَدُلٍ مِّنُکُمُ وَاَقِیُمُوا الشَّھَادَۃَ لِلّٰہِ. (سورۂ طلاق ۶۵:۲)

''اپنے میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنالو اور اللہ کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔''

اس آیت میں اقامت شہادت کا مفہوم، جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے، یہ ہے کہ شہادت ٹھیک ٹھیک حق و انصاف کے مطابق سب کے سامنے دی جائے۔ کسی خوف یا طمع کی وجہ سے شہادت میں کتر بیونت نہ ہو، بلکہ صورت معاملہ کو جوں کا توں بیان کر دیا جائے۔

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے:

وَاَقِیُمُوا الُوَزُنَ بِالُقِسُطِ وَلَا تُخُسِرُوا الُمِیُزَانَ. (سورۂ رحمٰن ۵۵:۹)

''انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور تول میں کمی نہ کرو۔''

اس آیت میں اقامت وزن کا مطلب تول میں انصاف کا حق ادا کرنا ہے، یعنی ترازو مستقیم ہو، باٹ صحیح ہو اور نیک نیتی سے وزن کیا جائے۔ یہ صحیح وزن کے شرائط ہیں۔ اگر ظاہری تول تو ٹھیک ہو، یعنی ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوں، لیکن باٹ صحیح نہ ہو تو تول کی یہ ظاہری درستی کوئی معنی نہیں رکھتی اور اس صحیح وزن کا اطلاق نہ ہوگا۔ اسی طرح باٹ تو صحیح ہو، لیکن ترازو کے دونوں پلڑے برابر نہ ہوں تو اس کو بھی صحیح وزن نہیں کہیں گے۔ فی الواقع صحیح وزن اور درست تول وہ ہے جس میں باٹ اور ترازو کی ظاہری درستی کے ساتھ جذبۂ نیک نیتی بھی شامل ہو۔ باٹ کتنا ہی صحیح ہو، ترازو کتنا ہی مستقیم ہو مگر دل میں کھوٹ ہو، یعنی ایمان داری نہ ہو تو ناپ تول میں خرابی کا آ جانا ناگزیر ہے۔

اقامت کے مذکورہ لغوی اور قرآنی مفہومات سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ سے محض نماز کی ظاہری ہیئت مراد نہیں، بلکہ نماز کو اس کے جملہ ارکان و شرائط کے ساتھ ادا کرنا ہے۔[۱۰] امام راغب نے لکھا ہے:

۹؎ مفردات راغب ۴۱۸۔

ولم یامر تعالی بالصلوۃ حیثما امر ولامدح بہ حیثما مدح الا بلفظ الاقامۃ تنبیھا ان المقصود منھا توفیۃ شرائطھا لاالاتیان بھیئاتھا.
(مفردات راغب ۴۱۸)

''اللہ تعالیٰ نے (قرآن مجید میں) جہاں کہیں نماز کا حکم دیا ہے یا اس کی مدح کی ہے تو اس کے لیے اقامت کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا ہے صرف اس امر پر متوجہ کرنے کے لیے کہ اقامت سے مقصود اس کے شرائط کی تکمیل ہے نہ کہ محض اس کی ظاہری ہیئت کی بجا آوری ہے۔''

شرائط نماز میں خصوصیت کے ساتھ تین چیزیں داخل ہیں، محافظت نماز، مداومت نماز اور تعدیل ارکان۔ اگر ان میں سے کوئی شرط بھی ساقط ہو جائے تو اس پر اقامت صلوٰۃ کا اطلاق نہ ہوگا، جیسا کہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ. (سورۂ نساء۴:۱۰۳)

''پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرو، پھر جب تمھیں اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز قائم کرو۔''

اس آیت کا تعلق حالت جنگ کی نماز سے ہے جو ایک رکعت پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس مختصر نماز کے لیے اقامت کا لفظ استعمال نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تعدیل ارکان، جو شرائط نماز میں سب سے اہم شرط ہے، مفقود ہے۔ اس کے علاوہ رکعتوں کی تعداد بھی کم ہے۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ جب اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز قائم کرو، یعنی اس کو جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرو۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اقامت کا اطلاق اسی نماز پر ہوگا جس میں جملہ ارکان نماز کامل اطمینان و سکون کے ساتھ ادا کیے جائیں، عدم اطمینان کی حامل نماز پر اقامت کا اطلاق نہ ہوگا۔

اسی مفہوم میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ. (سورۂ بقرہ۲:۲۳۹)

''اگر تم کو خطرہ درپیش ہو تو پیدل اور سوار، دونوں حالتوں میں نماز ادا کرو، اور جب خطرہ جاتا رہے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس کو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس آیت میں 'کَمَا عَلَّمَکُمْ' سے محض نماز کی ظاہری ہیئت کی تعلیم مراد نہیں، بلکہ شرائط نماز کی طرف بھی اس

۱۰؎ تفسیر خازن، ۱/۲۷۔

میں اشارہ ہے۔ گویا حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ حالت خوف رفع ہو جانے کے بعد نماز اس کے تمام ارکان سمیت کامل اطمینان وسکون کے ساتھ ادا کی جائے۔ جو لوگ نماز کی ظاہری ہیئت ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور شرائط نماز سے غفلت برتتے ہیں، یعنی نہ تو نماز اس کے صحیح وقت پر ادا کرتے ہیں (محافظت صلوٰۃ)، نہ اس پر مداومت اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے جملہ ارکان اطمینان وسکون کے ساتھ ادا کرتے ہیں، وہ مصلی تو ضرور ہیں، لیکن ان کو مقیم صلوٰۃ نہیں کہا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

انّ المصلین کثیر و المقیمین قلیل. (مسند احمد)

''مصلی (نمازی) تو بہت ہیں، لیکن مقیم نماز (یعنی اس کے حقوق ادا کرنے والے) بہت تھوڑے ہیں۔''

نماز باجماعت کا اہتمام بھی اقامت صلوٰۃ میں داخل ہے، جیسا کہ درج ذیل آیت سے بالکل واضح ہے:

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ. (سورۂ یونس ۱۰: ۸۷)

''اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی (ہارون) کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرا لو اور اپنے ان گھروں کو قبلہ بنا لو اور نماز قائم کرو، اور اہل ایمان کو بشارت دے دو۔''

اس آیت میں چند گھروں کو قبلہ بنا لینے اور ان میں اقامت صلوٰۃ کے حکم سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دراصل قوم موسیٰ کو نماز باجماعت کے اہتمام کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ اقامت کے اس مفہوم کو اور واضح کر دیا گیا ہے:

وَاِذَا کُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَکَ وَلْیَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَکُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِکُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا. (سورۂ نساء ۴: ۱۰۲)

''اور (اے پیغمبر) جب تم ان میں موجود ہو اور ان کو نماز پڑھا رہے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے ہتھیار لیے ہوئے ہو پھر جب وہ سجدہ کر چکے تو پیچھے ہو جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے تمھارے ساتھ نماز پڑھے۔''

دیکھیں، اس آیت میں جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھانے کا ذکر ہے وہاں اقامت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (وَاِذَا کُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ) اور جہاں مقتدیوں کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے وہاں اقامت کے

بجائے تصلیہ کا لفظ آیا ہے (فلیصلوا معك) اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اقامت صلوٰۃ میں نماز باجماعت شامل ہے۔ حدیث سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

سؤوا صفوفکم انّ تسویة الصفوف من اقامة الصلوٰة. (بخاری و مسلم)

''صفوں کو سیدھا کرو، کیونکہ صفوں کو سیدھا کرنا اقامت صلوٰۃ میں داخل ہے۔''

حقیقت صلوٰۃ

نماز دراصل خدا کی یاد اور اس سے قلبی و ذہنی تعلق کا ایک محسوس خارجی اظہار ہے۔ جس قدر یہ تعلق قوی ہوگا اسی قدر اس کی یاد بھی قوی ہوگی۔ خدا کی یاد کو قرآن مجید میں ذکر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ. (سورۂ طٰہٰ ۲۰:۱۴)

''بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ پس تم میری ہی بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔''

دوسری جگہ ہے:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَۃِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ. (سورۂ جمعہ ۶۲:۹)

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے پکارا جائے (یعنی اذان دی جائے) تو اللہ کے ذکر کی طرف تیز گامی کرو۔''

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ. (سورۂ عنکبوت ۲۹:۴۵)

''بے شک نماز بری باتوں اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے۔''

ذکر خدا کو قرآن مجید میں بعض مقامات پر خدا کا نام لینا بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی، وَ ذَکَرَ اسۡمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی. (سورۂ اعلیٰ ۸۷:۱۴-۱۵)

''کامیاب ہوا وہ شخص جس نے خود کو پاک کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔''

دوسری جگہ ہے:

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡھَا اسۡمُہٗ. (سورۂ بقرہ ۲:۱۱۴)

''اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا کے گھروں میں اس کا نام لینے سے روکیں۔''

نماز کے لیے خدا کا نام لینا ایک قدیم مذہبی تعبیر ہے۔تورات میں ہے:

''اور ابراہیم وہاں سے کوچ کر کے اس پہاڑ کی طرف گیا جو بیت ایل (بیت اللہ) کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرا اس طرح لگایا کہ بیت ایل مغرب میں اور 'عی' مشرق میں پڑا، اور وہاں اس نے خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور اس کا نام لیا۔'' (کتاب پیدایش، باب۱۲: ۸-۹)

کتاب پیدایش ہی میں ایک دوسرے مقام پر ہے:

''اسحاق نے وہاں ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا۔'' (کتاب پیدایش، باب ۲۶: ۲۵)

ذکر کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا کا نام زبان پر آ جائے بلکہ یہ بات بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ اس کی بے حد بڑائی بیان کی جائے، اس کی حمد وثنا کے ساتھ اس سے قرب ومحبت کا بے تابانہ اظہار ہو، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَ کُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا. (سورۂ بقرہ۲: ۲۰۰)

''جب تم اپنے (حج کے) مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم پہلے اپنے آبا و اجداد کو یاد کرتے رہے ہو، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اس کو یاد کرو۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰکُمْ. (سورۂ بقرہ۲: ۱۹۸)

''مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اس طرح اس کو یاد کرو جس طرح اس نے تمھیں ہدایت کی ہے۔''

ایام جاہلیت میں اہل عرب کا معروف دستور تھا کہ وہ حج کے اختتام پر مشعر حرام اور منیٰ میں جلسے منعقد کرتے تھے۔ ان جلسوں میں ہر قبیلہ کے شعرا اور خطبا اپنے اپنے قبائل کے مفاخر و محامد بالخصوص آبا و اجداد کی شجاعت و بسالت اور ان کی فیاضی و سیرچشمی کے واقعات کو شعر و خطابت کی شکل میں خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ آیات مذکورہ میں ان اعمال تفاخر سے باز آ جانے کے لیے کہا گیا ہے اور ساتھ ہی حکم دیا گیا ہے کہ اب باپ دادا کی بڑائی بیان کرنے کے بجائے خداے بزرگ و برتر کی عظمت و کبریائی بیان کی جائے اور اجداد کی تعریف سے کہیں بڑھ کر اس کی تعریف وتوصیف کی جائے کہ اس کائنات میں وہی ایک ہستی ایسی ہے جو فی الواقع ہر طرح کی تعریف و ستایش کے لائق ہے۔

ذکر کے اس مفہوم کی تائید ان آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں نماز کے لیے تسبیح کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ. (سورۂ طٰہٰ ۲۰: ۱۳۰)

''اور اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو آفتاب کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی اس کی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں بھی۔''

دوسری جگہ ہے:

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ. (سورۂ طور ۵۲: ۴۹)

''اور شب میں اور ستاروں کے پلٹنے کے وقت (وقت سحر) اس کی تسبیح کرو۔''

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا. (سورۂ احزاب ۳۳: ۴۲)

''اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔''

ان آیات میں نماز پڑھنے کو خدا کی تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے[11]، اور تسبیح کے معنی خدا کی پاکی اور اس کی بڑائی بیان کرنے کے ہیں۔ اعشیٰ کہتا ہے:

وسبح علی حین العشیات والضحی ولا تعبد الشیطان واللّٰہ فاعبدا

''صبح اور شام کے اوقات میں تسبیح کرو اور شیطان کی عبادت مت کرو، بلکہ اللہ ہی کی عبادت کرو۔''

روایت ہے کہ ایک بار معاویہ بن حکم سلمی، جو جلد ہی مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، شریک نماز تھے۔ کسی مسلمان کو چھینک آئی تو انھوں نے، جیسا کہ انھیں تعلیم دی گئی تھی، 'یرحمك اللّٰه' کہہ دیا۔ صحابہ نے ان کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ انھوں نے نماز ہی میں کہا: تم لوگ مجھے اس طرح کیوں گھور کر دیکھتے ہو؟ صحابہ نے اپنے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا تب جا کر وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ نماز ہو چکی تو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، نماز میں کون باتیں کر رہا تھا۔ صحابہ نے عرض کیا، معاویہ۔ آپ نے ان کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے فرمایا: نماز، قرآن

---

[11] تسبیح قول سے بھی ہوتی اور عمل سے بھی۔ قولی تسبیح کا مطلب خدا کی یاد اور اس کی بڑائی بیان کرنا، اور عملی تسبیح کا مطلب اس کی فرماں برداری ہے۔ قرآن مجید میں جہاں زمین اور آسمانوں کی تسبیح کا ذکر ہے وہاں اس سے مراد عملی تسبیح ہے، یعنی خدا کے حکم کی تعمیل جو ان کا طبعی وظیفہ ہے۔ انسان سے دونوں طرح کی تسبیح مطلوب ہے۔ نماز میں قولی اور عملی دونوں تسبیحیں جمع ہیں، جیسا کہ کلمات نماز (مثلاً، اللّٰہ اکبر، سمع اللّٰہ لمن حمدہ، ربنا لك الحمد، سبحان ربی العظیم، سبحان ربی الاعلیٰ) اور رکوع و سجدہ کے اعمال سے بالکل واضح ہے۔

پڑھنے، اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی و بڑائی بیان کرنے کا نام ہے، اس میں باتیں کرنا مناسب نہیں۔[12]

حقیقت نماز کا دوسرا قابل ذکر پہلو دعا ہے، یعنی قادر مطلق اور علیم و خبیر خدا کو پکارنا اور اس سے درخواست اور التجا کرنا۔ حضرت نعمان بن بشیر انصاری سے مروی ہے کہ ایک بار آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'الدعاء هو العبادة'[13] ''دعا ہی عبادت ہے'' اور اس کے بعد یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ. (سورۂ مومن ۴۰: ۶۰)	''تمھارے رب کا ارشاد ہے، مجھے پکارو، میں تمھاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے روگردانی کرتے ہیں وہ عنقریب رسوا ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور ارشاد سے حقیقت نماز کے اس دوسرے پہلو کی تائید ہوتی ہے، فرمایا:

''نماز دو دو رکعت کر کے ہے اور ہر دوسری رکعت میں تشہد اور گریہ وزاری ہے، خشوع و خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب، اے رب کہنا ہے۔ جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص رہی۔''

(ابوداؤد، باب: صلوٰۃ النہار، ترمذی، باب: ماجاء فی التخشع فی الصلوٰۃ)

صلوٰۃ اور عقیدۂ توحید

حقیقت نماز کے مذکورہ بالا پہلوؤں پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ وہ دراصل اسلام کے عقیدۂ توحید کا عملی اظہار ہے۔ سورۂ فاتحہ نماز کا ایک لازمی جز ہے اور تمام تر توحیدی تعلیم پر مشتمل ہے۔ اسی سورہ میں یہ فقرے موجود ہیں: 'اياك نعبد و اياك نستعين' ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔'' ہر نمازی اپنی زبان سے روزانہ کم از کم پانچ بار ان الفاظ کو دہراتا ہے اور ان کے ذریعہ خدا سے اس کی عبادت و استعانت کا عہد باندھتا ہے اور غیر خدا کی عبادت و استعانت سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ 'و اياك نستعين' میں ''واؤ'' بیان کا ہے، یعنی 'اياك نعبد' کی تشریح کے لیے لایا گیا ہے کہ استعانت عبادت کے مفہوم میں داخل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مافوق الطبیعی طور پر خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو حاجات و مصائب میں مدد کے لیے پکارنا اس کی عبادت کے مترادف ہے۔

---

[12] سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ۔

[13] سنن ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الدعا۔

شرک کی بنیاد ہمیشہ سے اس غلط خیال پر قائم رہی ہے کہ اس کائنات میں خدا کے علاوہ اس کی بعض مخلوقات، مثلاً فرشتے، سیارے اور بعض وفات یافتہ نیک لوگ (انبیا و اولیا)، بھی صاحب قوت ہیں اور وہ بندوں کو نفع اور نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں، اور یہ اختیار ان کو خدا نے عطا کیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں اس مشرکانہ خیال کی تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو خدا اس کائنات کا خالق و مالک ہے وہی اس پر مکمل اختیار و تصرف رکھتا ہے۔ اس کے سوا اس کائنات خلقت میں کوئی دوسرا وجود ایسا نہیں جو نظام عالم میں تصرف تو کجا بذات خود کسی نوع کا کوئی ادنیٰ اختیار و اقتدار بھی رکھتا ہو۔ اور ایسا بھی نہیں کہ خدا نے اپنے اقتدار اعلیٰ کا کوئی حصہ اپنی کسی مخلوق کی طرف منتقل کر دیا ہو اور وہ صاحب اختیار بن گئی ہو۔ اس نوع کی شرکت اقتدار سے نظام جہاں ناآشنا ہے۔ فی الواقع نظام عالم پر ایک ہی خدا غالب و مستولی ہے۔ وہی حاکم و آمر ہے، وہی نافع و ضار ہے، وہی مشکل کشا، حاجت روا اور فریاد رس ہے۔ اس کائناتی حقیقت کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ.

(سورۂ اعراف ۷: ۵۴-۵۵)

”سن لو! خلق اور امر دونوں اسی کے لیے خاص ہیں۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، تمام جہانوں کا آقا اور پرورش کنندہ۔ اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے پکارو۔ وہ یقیناً حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ، اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ. (سورۂ فاطر ۳۵: ۱۳-۱۴)

”وہی اللہ تمھارا رب ہے۔ اقتدار و بادشاہی اسی کی ہے۔ اسے چھوڑ کر جن کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے بھی مالک نہیں (یعنی بالکل بے اختیار ہیں) اگر تم انھیں پکارو تو وہ (بذات خود) تمھاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر (کسی خدائی ذریعہ سے) سن بھی لیں تو کوئی جواب نہیں دے سکیں گے اور قیامت کے روز وہ تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے۔ ایک باخبر کے سوا کوئی دوسرا تمھیں (ان حقائق سے) آگاہ نہیں کر سکتا۔“

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا

”اور کہو کہ شکر و ستایش کا سزاوار ہے وہ اللہ جس کے

وَّلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ شَرِيۡكٌ فِى الۡمُلۡكِ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرۡهُ تَكۡبِيۡرًا.
(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷:۱۱۱)

نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کے اقتدار و حکومت میں اس کا کوئی ساجھی ہے، اور نہ اس کے عجز کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے، اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔''

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوۡ يَرَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعَذَابِ، اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِيۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا وَرَاَوُا الۡعَذَابَ وَتَقَطَّعَتۡ بِهِمُ الۡاَسۡبَابُ، وَقَالَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا لَوۡ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنۡهُمۡ كَمَا تَبَرَّءُوۡا مِنَّا كَذٰلِكَ يُرِيۡهِمُ اللّٰهُ اَعۡمَالَهُمۡ حَسَرٰتٍ عَلَيۡهِمۡ وَمَا هُمۡ بِخٰرِجِيۡنَ مِنَ النَّارِ. (سورۂ بقرہ ۲: ۱۶۵-۱۶۷)

''اور لوگوں میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھیراتے ہیں، جن سے وہ محبت کرتے ہیں بالکل خدا کی محبت کی طرح۔ لیکن جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ خدا سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم دیکھ سکتے اس حالت کو جب عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان کو اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ ساری قوت اور کل اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اور اللہ نہایت سخت سزا دینے والا ہے۔ اس وقت کا خیال کرو جب قائد اپنے پیرووں سے بیزاری ظاہر کریں گے، اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تعلقات کا تانا بانا ٹوٹ چکا ہوگا۔ اور پیرو کہیں گے کہ اے کاش، ہمیں ایک بار دنیا میں واپس جانے کا موقع ملتا تو ہم بھی ان سے اسی طرح بیزاری دکھاتے جس طرح انھوں نے ہم سے بیزاری دکھائی ہے۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال ان کو دکھائے گا جو ان کے لیے موجب حسرت و پشیمانی ہوں گے۔ اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔''

[باقی]

رضوان اللہ

میاں بیویوں کے سربراہ ہی ہیں

ماہنامہ اشراق فروری ۲۰۱۳ میں ہماری ایک تحریر ''میاں بیویوں کے سربراہ ہیں'' کے نام سے شائع ہوئی جو اصل میں ہمارے ممدوح جناب پروفیسر خورشید عالم کے ایک مضمون پر محض اس امید پر لکھی گئی تھی کہ آیت 'قوامون' کی تفہیم میں جو ناروا اندیشے اور بے جا مغالطے در آئے ہیں، ان کا کسی حد تک مداوا ہو۔ اس کے جواب میں ہمارے استدلال سے صرف نظر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا گیا، اس پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا ہم اخلاقی قدروں کا استیصال اور اپنے وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ البتہ ہماری دو ایک باتیں جنھیں حوالوں کے بغیر اس لیے ذکر کر دیا گیا تھا کہ وہ اہل علم کے ہاں معروف بھی ہیں اور مقبول بھی، ان کے حوالہ جات ہم یہاں ضرور بیان کیے دیتے ہیں:

'قام الرجل علی المراۃ' کے ضمن میں ہم نے جو عرض کیا تھا کہ اہل لغت اس کے معنی بیان کرتے ہوئے صرف 'مانها' ہی کہہ دینے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ 'قام بشانها' کا بھی ذکر کرتے ہیں تو اس کے لیے علامہ فیروز آبادی کی ''القاموس''، علامہ الزبیدی کی ''تاج العروس'' اور علامہ سعید خوری کی ''اقرب الموارد'' دیکھ لی جا سکتی ہیں۔ ان میں اس محاورے کا مطلب بالترتیب، 'مانها و قام بشانها'، 'مانها و قام بشانها متکفلا بامرها' اور 'مانها و قام بشانها' کے الفاظ ہی سے ادا کیا گیا ہے۔

اسی طرح 'فلان قوام اهل بیته' کا معاملہ ہے۔ اس کا مطلب بھی یہ نہیں کہ مرد اپنے گھر والوں کے محض مالی کفیل ہوتے ہیں، بلکہ یہی ہے کہ وہ ان کے معاملات کا انتظام کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہماری اس بات کے لیے جوہری کی ''تاج اللغۃ'' اور ابن منظور کی ''لسان العرب'' کفایت کرتی ہے۔ اول الذکر میں اس کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں: 'وهو الذی یقیم شانهم'۔ اور ثانی الذکر میں بھی ابو عبیدہ کے حوالے سے اس کے معنی ٹھیک انھی الفاظ میں

بیان کیے گئے ہیں۔

جہاں تک 'قنتت المراة لزوجها' کا تعلق ہے تو یہ بھی اہل عرب کے ہاں رائج اور ماہرین لغت کے ہاں ایک معروف محاورہ ہے۔اس کی دلیل کے لیے بھی ''لسان العرب''، ''اقرب الموارد'' اور علامہ زمخشری کی ''اساس البلاغہ'' کی طرف مراجعت کر کے انھیں بآسانی وہاں دیکھ لیا جا سکتا ہے۔